اعتبارِ وفا

نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا... گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے... کہ دل ودماغ کو کوئی دوسری بات سُجھائی تک نہیں دیتی۔
ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔
مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے... لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے... اور مان لیا جائے... کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے... اور وفا کے غنچے وہیں کھلتے ہیں... جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دُھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصّہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں

''مقبول بٹ...... بالی......'' اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا اور وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔
''بالی یار رکو......'' وہ نوجوان ایک راہداری کی طرف مڑا تو اس کی طرف بڑھتے ہوئے وہ یک دم ٹھٹک کر رک گیا، اس کی نظر اچانک ہی دائیں طرف راہداری میں لگے بیسن کے آئینے پر پڑی تھی۔ کنپٹی پر سے سفید ہوتے بال، چہرے پر گزرتی عمر کے واضح نشان اور یہ عمر صرف اس پر سے تو نہیں گزری تھی۔ مقبول بٹ بھی تو چھتیس سال بعد بالکل ویسا نہیں رہا ہوگا...... اس کے بالوں میں بھی تو سفیدی کہیں نہ کہیں اتری ہوگی۔ اور گزرے ماہ و سال نے چہرے پر اپنے نشان چھوڑے ہوں گے تو پھر یہ نوجوان...... آج سے چھتیس سال پہلے کے مقبول بٹ کی کاپی بالکل وہی شکل... صورت...... ویسے ہی سلکی بال پیشانی پر پڑے ہوئے جنہیں وہ بالکل مقبول بٹ کے انداز میں ہاتھ کی پشت سے پیچھے کرتا ہوا تیز، تیز چلتا ہوا راہداری میں گم ہو گیا تھا۔
''اور میں بھی کتنا پاگل ہوں کہ اسے مقبول بٹ سمجھ بیٹھا۔ جیسے درمیان میں چھتیس سال نہیں گزرے چند دن گزرے ہوں۔'' ایک مدھم سی مسکراہٹ اس کے لبوں کے گوشوں پر نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔
یہ نوجوان پتا نہیں کون تھا جو اتنا زیادہ مقبول بٹ سے ملتا تھا۔ اتنی مشابہت کہ وہ بھی ماہ و سال کا حساب کیے بغیر اسے مقبول بٹ سمجھ بیٹھا تھا۔
''کہیں یہ مقبول بٹ کا بیٹا ہی نہیں ہو۔'' ایک خیال اڑتا، اڑتا سا اس کے ذہن میں آیا تو اس نے اسے دیکھنے کے لیے سامنے نظر دوڑائی۔ راہداری دور، دور تک سنسان پڑی تھی۔ پھر راہداری کے دونوں اطراف بنے ہوئے کمروں میں سے ایک کا دروازہ کھلا اور ایک میل نرس کسی پیشنٹ کی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا باہر نکلا۔
''کیا خبر وہ ان کمروں میں سے کسی کے اندر چلا گیا ہو...... لیکن پتا نہیں وہ کس کمرے میں گیا ہے۔ اور اگر وہ مجھے نظر آ جائے تو میں اس سے پوچھوں گا کہ اس کے باپ کا نام کیا ہے اور... کیا وہ کسی مقبول بٹ کو جانتا ہے۔ مقبول بٹ کیسا پیارا آدمی تھا یاروں کا یار...... ہر ایک کی مدد کے لیے تیار...... اور اگر جو وہ انگلینڈ نہ گیا ہوتا اس وقت وہاں ہوتا وہ اس مشکل وقت یہاں ہوتا تو ضرور میری مدد کرتا اور پھر شاید زندگی کا رنگ ایسا نہ ہوتا کچھ اور ہی ہوتا......''
بہت سارے منظر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ اور وہ وہاں ہی ساکت کھڑا ان منظروں میں گم ہوا ہی چاہتا تھا کہ عظام نے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
''پاپا...... چلیں آپ کو رواحہ کے پاس لے چلوں۔''
''ہاں چلو......'' ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے راہداری میں دور تک نظر دوڑائی لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے عظام کے ساتھ چل پڑا۔
''پاپا...... وہ...... بابا انجائنا کے پیشنٹ ہیں، میں نے ابھی تک انہیں یہ نہیں بتایا کہ رواحہ کو گولیاں لگی ہیں۔ آپ بھی ذکر مت کیجیے گا۔'' اس نے صرف سر ہلایا تھا۔
''آپ کی انسپکٹر سے کیا بات ہوئی؟''
''وہ دو دن تک بیان لینے نہیں آئے گا۔ تم بے فکر رہو...... لیکن بیان تو بہرحال اسے لینا ہی پڑے گا۔ تم رواحہ کو سمجھا دینا کسی کا نام لینے کی ضرورت نہیں...... بس یہ کہہ دے کہ اسے علم نہیں ہے کہ گولیاں چلانے والے کون تھے اور یہ کہ اس کی کسی سے دشمنی نہیں ہے یوں بھی یہاں اپنے اس شہر میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ کوئی نامعلوم شخص گولیاں مار کر چلا گیا۔''
''لیکن کیوں پاپا...... جب رواحہ کو یقین ہے کہ یہ کام ظفری کا ہی ہے تو پھر وہ کیوں نہ اس کا اور اس کے چچا کے گارڈ کا نام مشتبہ افراد میں لکھوائے۔ آخر پہلے بھی تو انہوں نے اسے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔'' عظام کے لہجے

میں ہلکا سا احتجاج تھا۔
''میں اسے مناسب نہیں سمجھتا عظام۔'' ثمر حیات نے بے حد نرمی سے کہا۔
''لیکن اس طرح تو وہ لوگ اور شیر ہو جائیں گے اور اگلی بار پھر وہ ایسی کوئی کوشش کر سکتے ہیں اور خدانخواستہ پھر اگر وہ کامیاب ہو گئے تو......'' عظام نے تشویش سے اسے دیکھا۔
''ان کا مقصد رواحہ کو مارنا نہیں تھا بیٹا ورنہ ان کا نشانہ خطا نہ جاتا...... وہ صرف رواحہ کو ڈرانا چاہتے تھے اور ہم نے انہیں یہ ہی تاثر دینا ہے کہ ہم ڈر گئے ہیں۔'' برسوں کے تجربے سے انہوں نے یہی اخذ کیا تھا کہ اگر انہوں نے رواحہ کو مارنا ہوتا تو ان جیسے لوگوں کے لیے یہ مشکل نہ تھا کہ وہ کہیں بھی، کسی بھی جگہ، کسی بھی وقت اس کی زندگی ختم کر سکتے تھے۔
''آپ کی بات ٹھیک ہے پاپا......'' عظام نے ساتھ، ساتھ چلتے ہوئے ذرا سا رخ ان کی طرف موڑا۔'' لیکن یہ تو ظلم کے ہاتھ مضبوط کرنے والی بات ہے...... کیا ہمیں ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھانی چاہیے؟''
''تمہاری عمر میں شاید میں بھی ایسے ہی سوچتا لیکن زندگی کے تجربات سے میں نے یہی سیکھا ہے کہ ایسے لوگوں سے دور ہی رہنا چاہیے۔ تم انہیں نہیں جانتے عظام اگر رواحہ نے ان کے خلاف بیان دیا تو وہ تو ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ پولیس بھی ان ہی جیسے لوگوں کے ہاتھوں میں کھیلتی ہے۔ پولیس بھی ان کی اپنی اور نظام بھی ان کا اپنا...... ان کا کچھ نہیں بگڑے گا میری جان لیکن وہ رواحہ کو معاف نہیں کریں گے اور رواحہ پروفیسر صاحب کا اکلوتا بیٹا ہے۔ بس اللہ پر چھوڑ دو۔''
عظام لمحہ بھر کو خاموش ہو گیا مگر پھر چند قدم چل کر پوچھ بیٹھا۔
''پاپا...... میں بات کروں ظفری سے...... اسے سمجھاؤں کہ وہ خواہ مخواہ......''
''ہرگز نہیں...... '' ثمر حیات نے تڑپ کر اسے دیکھا۔'' تم ان لوگوں سے دور رہو گے۔''
''پاپا......'' عظام نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔
''تم کچھ مت کہو عظمی...... تم نہیں جانتے، تم بالکل نہیں جانتے ان لوگوں کو، کتنے ظالم اور شقی القلب ہیں یہ سائیں مٹھا اور اس کے چیلے......'' ایک گہرے درد نے دل سے اٹھ کر جیسے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ اور اذیت رگوں کو کاٹتی خون میں دوڑنے لگی۔ ان جلتی آنکھوں سے وہ ماضی کے منظر دیکھنے لگا۔
اس روز وہ اسلامیہ پارک میں بسمل خان سے جو ایک چھوٹے سے مکان میں رہائش پزیر تھا مل کر آ رہا تھا اور یہ سائیں مٹھا کو شاہجہان بیگم کے کوٹھے سے بھگانے کے ٹھیک تین دن بعد کی بات تھی۔ شیر خان سڑک پر گاڑی میں اس کا منتظر تھا اور وہ اردگرد سے بے نیاز بسمل خان سے ہونے والی گفتگو کو سوچتا ہوا میانی والے قبرستان کی چار دیواری کے ساتھ، ساتھ چلتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا جب دو بندوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ دونوں اس کے دائیں بائیں چلنے لگے تھے۔
''خاموشی سے چلتے رہو۔'' ایک نے کرخت آواز میں کہا تھا اور ساتھ ہی اسے اپنے پہلو میں ریوالور کی چبھن محسوس ہوئی تھی۔ وہ کون تھے، وہ نہیں جانتا تھا اس سے پہلے اس نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔
''کون ہو تم لوگ...... اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس نے باری، باری دونوں کی طرف دیکھا تھا۔
''اتنے اتاؤلے کیوں ہو رہے ہو، سیدھی طرح چلتے رہو ابھی پتا چل جائے گا کون ہیں ہم اور کیا چاہتے ہیں۔'' وہ اس سچویشن پر غور کرتا ہوا ان کے ساتھ چلنے لگا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ان کا مقصد کیا ہے...... اگر لوٹنا مقصود ہوتا تو اس وقت آس پاس کوئی نہیں تھا وہ آسانی سے اسے لوٹ کر چلتے بنتے...... شاید وہ اسے کسی کے پاس

لے جانا چاہتے تھے......لیکن کس کے پاس......اور یہاں اس وقت کیا وہ اس کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ کیا انہیں علم تھا کہ وہ یہاں اس وقت بسمل خان کے گھر آیا ہوا ہے۔ وہ الجھا، الجھا ہوا سا اُن کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ کچھ بھی اندازہ کرنے سے قاصر رہا تھا۔ وہ ان کے ساتھ جس سڑک پر آیا تھا وہ نسبتاً سنسان اور ویران تھی۔ اس وقت وہاں صرف ایک پجارو کھڑی تھی اور گاڑی سے ٹیک لگائے جو شخص کھڑا تھا اسے دیکھ کر بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''تو یہ تم ہو سائیں مٹھا......''

''اوہ......'' اس نے ہونٹ سیٹی بجانے کے سے انداز میں سکیڑے۔ ''تو پہچان لیا تم نے۔'' اس کے ہونٹوں پر تمسخرانہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''ابھی کہاں پہچانا ہے سائیں۔'' اس کے دائیں طرف کھڑے شخص نے ریوالور کی نال اس کی پہلو میں چبھوتے ہوئے کہا تھا۔ ''پہچان تو ہم اسے کرائیں گے اچھی طرح۔''

''نہیں پہچانا تو اب پہچان لے گا۔'' دوسرا بھی بولا۔

وہ گاڑی کی ٹیک چھوڑ کر دو قدم اس کی طرف بڑھا اور اب اس کے بالکل مقابل کھڑا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا۔

دونوں کچھ دیر ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ سائیں مٹھا کے مسکراتے ہوئے لب بھنچ گئے تھے اور آنکھوں سے نفرت اور سختی جھلکنے لگی تھی۔

''تو تم حاتی دادا ہو، خانو دادا کے چمچے......لیکن مجھے جانتے ہو میں کون ہوں؟''

''مجھے تمہیں جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں پھر بھی اگر تم مجھ سے اپنا تعارف کروانا چاہتے ہو تو شوق سے کراؤ۔'' وہ اب بھی سائیں مٹھا کی طرف دیکھ رہا تھا اور جانچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے سامنے کھڑا نوجوان جو اس سے آدھی عمر کا ہوگا وہ اپنے دل میں اس کے لیے کیا ارادہ کیے ہوئے ہے۔ کیا وہ محض اسے دھمکانا چاہتا ہے یا پھر وہ اسے مار دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

سائیں مٹھا نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھوں سے اشارہ کیا تھا۔ شاید تب ہی دائیں طرف کھڑے شخص نے اس کے پہلو میں زوردار مکا مارا۔

''تعارف کراؤں تم سے سائیں کا؟'' ساتھ ہی ایک مکا اس کی پسلیوں پر پڑا تھا۔

''مزید تعارف میں کرواتا ہوں جیرے۔'' بائیں طرف والے نے اپنی انگلیاں اس کے پیٹ میں چبھوئیں۔

''بس......'' سائیں مٹھا نے ہاتھ ذرا بلند کیا تھا۔ ''پہلے میں اسے اس کا سارا بایو ڈیٹا نہ بتا دوں۔''

''مجھے اپنے بایو ڈیٹا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے مسٹر، مطلب کی بات کرو جس کے لیے یہاں بلایا ہے۔'' وہ اندازہ کر چکا تھا کہ ان کا مقصد محض خوفزدہ کرنا ہے۔

''مطلب کی بات بھی کر لیتے ہیں دادا، اتنی جلدی کیا ہے؟'' ساتھ ہی اس نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھتے ہوئے ابرو اچکائے تھے اور اس کے ساتھ ہی دونوں آدمیوں نے بیک وقت آگے بڑھ کر اس پر حملہ کیا تھا۔ ایک کا مکا اس کے جبڑے پر پڑا تھا۔ اور دوسرے نے پیٹ پر اپنا ہنر آزمایا تھا درد کی ایک شدید لہر سر سے لے کر پاؤں تک اس کے وجود میں پھیل گئی تھی لیکن وہ صبر اور ضبط کیے کھڑا رہا تھا۔

''تو مسٹر دادا......'' سائیں مٹھا کے لہجے میں تمسخر تھا۔

''سائیں حکم کریں، آج اس کی دادا گیری یہیں ہی نکال دیتے ہیں۔'' ایک شخص نے سائیں مٹھا کی طرف دیکھا تھا لیکن وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ہاں کیا نام ہے تمہارا...... حاتی داداتم مطلب کی بات سننا چاہتے ہو ناں تو سنو...... آئندہ اگر تم مجھے شاہجہان کے کوٹھے پر تو درکنار اس بازار کے ارد گرد بھی کہیں دکھائی دیے تو تمہاری بوٹی ، بوٹی کر کے چیل کوؤں کے آگے پھنکوادوں گا سمجھے......''

''اور اگر یہی بات میں تم سے کہوں تو......؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''تم......'' سائیں مٹھا زور سے ہنسا تھا۔''تمہیں شاید ابھی میری پہچان نہیں ہوئی۔''

''اور تم بھی شاید اس روز کو بھول گئے ہو۔''

''بھولا نہیں ہوں۔'' وہ بولا نہیں پھنکارا تھا۔''سائیں مٹھا...... اپنی بے عزتی نہیں بھولتا اور نہ ہی اپنی بے عزتی کرنے والوں کو معاف کرتا ہے لیکن تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں صرف اس شرط پر کہ آئندہ میرے راستے میں مت آنا ورنہ......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہے مسٹر مٹھا نہ ہی میری تم سے ذاتی طور پر کوئی دشمنی ہے لیکن تم نے اگر شاہجہان بیگم یا ان کی لڑکیوں کو تنگ کیا تو میں......''

''شاہجہان بیگم اور ان کی لڑکیوں سے کیا رشتہ ہے تمہارا...... ماں بہنیں ہیں تمہاری۔'' اس نے تمسخر سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی بات کاٹی تھی اور اس نے بہ مشکل اپنے اشتعال پر قابو پایا تھا۔

جلیل خان کی صحبت اور ٹریننگ میں اس نے اپنے اشتعال اور غصے پر قابو پانا سیکھا تھا...... نازک سے نازک صورتِ حال میں بھی وہ خود پر پورا کنٹرول رکھتا تھا۔

''وہ میری بہنیں نہیں ہیں لیکن وہ مظلوم ہیں۔'' اس نے بے حد تحمل سے کہا تھا۔''اور میں تمہیں ان کے ساتھ ظلم کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

''اچھا......'' سائیں مٹھا نے قہقہہ لگایا تھا۔

''دیکھو حاتی دادا وہ ایک طوائف کا کوٹھا ہے۔ جہاں جس کا جی چاہے جائے۔ تمہیں کیا تکلیف ہے۔''

''مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔'' اس نے اسی تحمل سے کہا تھا۔''ہزار بار تماش بین بن کر جاؤ...... گانا سنو...... رقص دیکھو اور......''

لمحہ بھر کے لیے بات ادھوری چھوڑ کر اس نے سائیں مٹھا کی طرف دیکھا تھا جو عجیب تمسخر اڑاتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''لیکن ان پر ظلم و زیادتی مت کرو...... جبر نہ کرو جو کچھ تم نے اس بیچاری کوئل کے ساتھ کیا ہے۔''

''کیا تم خدائی فوجدار ہو دادا...... چلو تم اپنا کام کرو اور ہمیں اپنا کام کرنے دو......''

''سائیں قصہ ختم کریں، حکم کریں۔'' دائیں طرف والا شخص جس کے چہرے پر بڑا سا مسہ تھا اور جو تقریباً سائیں مٹھا کی ہی عمر کا تھا آگے بڑھا۔

''نہ......'' سائیں مٹھا نے ہاتھ ذرا سا اونچا کیا تھا۔''میں خواہ مخواہ کسی کے خون میں ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا...... سمجھ دار آدمی ہے سمجھ گیا ہوگا جو سمجھایا ہے۔''

''کوئل بیچاری کا خون بھی تو خواہ مخواہ بہایا ہے تم نے۔'' اس کے لبوں سے غیر ارادی طور پر نکلا تھا۔

''کوئل......'' اس نے قہقہہ لگایا تھا۔''اسے میں نے نہیں مارا تھا وہ تو خود ہی ٹیرس سے کود گئی تھی۔''

''اور اسے کودنے پر کس نے مجبور کیا تھا تم نے...... ہاں۔'' کوئل کی سُریلی آواز اس کے کانوں میں گونجی اور اس کے اندر دور تک دکھ پھیلتا گیا۔

''ارے نہیں وہ تو چوہدری......'' سائیں مٹھا کے منہ سے بے اختیار نکلا لیکن اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی......اور پھر یک دم ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے رخسار پر اپنی پوری طاقت سے تھپڑ مارا تھا اور جب اس نے دوسری بار تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سائیں مٹھا نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔

''چاہوں تو ابھی تمہاری کلائی کا جوڑ الگ کر دوں۔'' ثمر حیات نے کہتے ہوئے ایک جھٹکا دے کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

''سائیں مٹھا اچھی طرح کان کھول کر سن لو......شاہجہان بیگم اور اس کے چوبارے کو بھول جاؤ......ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔'' اس نے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر اسے ہلکا سا دھکیلا وہ گاڑی سے جا لگا تھا۔

سے والا شخص تیر کی طرح اس کی طرف بڑھا تھا اور پیچھے سے اس کی کمر میں زوردار لات ماری تھی۔

''سائیں یہ اس طرح نہیں سمجھے گا......ہم اسے اچھی طرح سمجھاتے ہیں۔''

''ہاں اچھی طرح سمجھا دو......'' سائیں مٹھا نے بھی کہا تھا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر اپنی طرف بڑھتے شخص کو سر کی ٹکر مارتے ہوئے لات ماری تھی......وہ شخص اچھلتا ہوا دور جا گرا تھا۔ جبکہ دوسرے نے فوراً ہی ریوالور نکال لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا کہیں سے ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی تھی اور ریوالور اڑتا ہوا دور جا گرا تھا۔ یقیناً اتنا غضب کا نشانہ شیر خان کا ہی ہو سکتا تھا اور پھر قبرستان کی دیوار کے پیچھے اسے شیر خان کا سر نظر آیا تھا اور دوسرے ہی لمحے شیر خان گن ہاتھ میں اٹھائے دیوار پر سے چھلانگ لگا کر تیزی سے ان کے قریب آیا تھا۔

''کون ہو تم......؟'' سائیں مٹھا نے غصے سے شیر خان کی طرف دیکھا تھا۔

''اپنی راہ جاؤ اور ہمارے معاملے میں دخل اندازی نہ کرو۔'' وہ شخص تیزی سے اپنے ریوالور کی طرف بڑھا لیکن شیر خان نے پھرتی سے آگے بڑھ کر اس کی کنپٹی پر ریوالور کی ضرب لگائی تھی جس نے اسے لمبا لٹا دیا تھا۔ سے والا شخص بھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جسے شیر خان کی لات نے دوبارہ زمین بوس کر دیا تھا لیکن شیر خان نے اطمینان کی خاطر اس کی کنپٹی پر بھی ریوالور کی ایک ضرب لگائی تھی۔ تب ہی سائیں مٹھا نے تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر ڈیش بورڈ پر پڑا اپنا پسٹل اٹھانے کی کوشش کی لیکن پاس کھڑے ثمر حیات نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے پیچھے کھینچ لیا تھا۔ سائیں مٹھا کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ وہ اس سے لپٹ پڑا تھا لیکن اپنے چیلوں سے دوسروں کو پٹوانے والا خود لڑائی بھڑائی میں اتنا ماہر نہیں تھا سو جلد ہی زمین چاٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ ثمر حیات نے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر اوپر اٹھایا تھا۔

''آئندہ کسی لڑکی کے ساتھ بھلے وہ کوٹھے کی ہی کیوں نہ ہو ایسا سلوک مت کرنا جیسا سلوک کومل کے ساتھ کیا تھا تم نے اور آئندہ کبھی شاہجہان بیگم کے چوبارے پر قدم مت رکھنا۔''

اس نے ایک جھٹکے سے اس کے بال چھوڑ دیے تھے اور وہ منہ کے بل زمین پر گر گیا تھا اس اثنا میں شیر خان نے دونوں آدمیوں کے ریوالور اور گاڑی میں پڑے ہوئے پسٹل سے گولیاں نکال کر جیب میں ڈال لی تھیں۔ سائیں مٹھا کے لبوں سے بے حد گندی گالیاں نکل رہی تھیں۔ اس نے اسے پاؤں سے ٹھوکر ماری۔

''اپنی غلیظ زبان بند کرو سائیں مٹھا۔'' زمین پر پڑا ہوا ایک شخص ہولے ہولے کسمسا رہا تھا شیر خان کے کہنے پر وہ انہیں یوں ہی اسی حالت میں چھوڑ کر وہاں سے چلے آئے تھے۔

''کاش اس روز اس نے سائیں مٹھا کی بات چپ چاپ سن لی ہوتی تو......کاش اس روز وہ جانتا ہوتا کہ وہ ایک ایسے شخص کو اپنا دشمن بنا بیٹھا ہے جو......''

''پاپا......''عظام نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔''آپ ٹھیک ہیں ناں......''
''ہاں......''اس نے چونک کر عظام کی طرف دیکھا اور زبردستی مسکرایا۔
''کیا آپ ظفری کے چچا کو پہلے سے جانتے ہیں...... پاپا......اور کیا اس نے کبھی آپ کو کوئی نقصان پہنچایا ہے؟''
''ایسے لوگوں کے متعلق سب کو ہی پتا ہوتا ہے جانم......''اس نے ایک گہری سانس لی تھی......وہ آئی سی یو کے سامنے پہنچ چکے تھے......اس نے آئی سی یو کے باہر بیٹھے رواحہ کے بابا کو تو دیکھا تھا۔عظام نے اس کو ان کی طرف متوجہ کیا۔
''پروفیسر صاحب تو وہ بیٹھے ہیں باہر۔''
''میں نے کہا بھی تھا بابا سے کہ وہ کمرے میں چلے جائیں۔''عظام بات کر کے اُن کی طرف بڑھا۔ انہوں نے بھی اسے دیکھ لیا اور اٹھ کر بے تابانہ اس کی طرف بڑھے۔
''عظام...... عظمی۔''
وہ بے حد پریشان اور گھبرائے ہوئے سے لگ رہے تھے۔عظام کو یک دم ادراک ہوا کہ انہیں رواحہ کو گولیاں لگنے کے متعلق پتا چل گیا ہے۔ورنہ کچھ دیر پہلے تو وہ انہیں خاصا مطمئن چھوڑ کر گیا تھا۔
''عظمی...... بیٹا میری بات سنو......''
''بابا میں پاپا کو رواحہ کے پاس چھوڑ کر آ رہا ہوں۔بس ایک منٹ۔''
اس نے ثمر حیات کو آئی سی یو سے باہر آتے جواد کے حوالے کیا اور خود پلٹ کر اُن کے پاس آیا۔
''جی بابا کیا بات ہے؟''اس نے ان کے ٹھنڈے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔
''بیٹا...... وہ لوگ کون تھے جنہوں نے میرے رواحہ کو......''ان کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔''میری تو کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے پھر کیوں عظمی......ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔''
''بابا پلیز ریلیکس!''اس نے اپنے ہاتھوں میں دبے ان کے ہاتھوں کو ہولے سے دبایا۔''آپ پریشان نہ ہوں۔''
''بھلا کیسے پریشان نہ ہوں ؟''انہوں نے ناراضی سے اسے دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔''میرے بچے نے کسی کا کیا بگاڑا تھا عظام جو......
''آپ کو تو پتا ہے بابا یہاں کے حالات کا......موٹر سائیکل سوار راہ چلتے لوگوں پر گولیاں چلا کر غائب ہو جاتے ہیں۔''
''نہیں...... میرا دل نہیں مانتا کہ کسی نے یونہی بلاوجہ میرے رواحہ پر گولی چلائی ہوگی...... مجھے سچ بتاؤ...... میری جان مجھ سے کچھ مت چھپاؤ......اگر یہاں اس کی جان کو خطرہ ہے تو ہم کہیں اور چلے جاتے ہیں بہت دور کسی دور افتادہ جگہ پر۔''
عظام پریشان ہو گیا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے انہیں سب سچ بتا دے یا چھپا لے۔
''بولو ناں بیٹا...... بتاؤ کیا بات ہے؟''انہوں نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''کیا یہ وہی لوگ تھے جو گھر میں بھی گھس آئے تھے؟''
''معلوم نہیں بابا......''عظام نے نظریں چرائیں۔
''یہ تو رواحہ ہی بتا سکتا ہے، اس کی طبیعت کچھ مزید بہتر ہو جائے اور وہ اسے کمرے میں منتقل کر دیں تو میں پوچھوں گا اس سے۔''

''میرا خیال ہے یہ وہی لوگ ہوں گے، کیا نام تھا اس لڑکے کا...... ہاں یاد آیا ظفری...... اس کے بندے......؟'' انہوں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''تو تم رواحہ کو سمجھاتے کیوں نہیں کہ وہ اس لڑکی کا خیال چھوڑ دے...... کیا میرے رواحہ کے لیے لڑکیوں کی کمی ہے۔'' ان کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب ہوئیں۔

''کیا ضروری ہے عظام کہ صرف وہی لڑکی...... کوئی اور لڑکی بھی تو ہو سکتی ہے۔'' ان کی آنکھوں کے سامنے ارتفاع کا چہرہ آ گیا۔ ان کے بالکل سامنے صوفے پر بیٹھی بار، بار آنسوؤں سے بھر جانے والی آنکھوں کو پونچھتی ہوئی...... بے چینی سے عظام سے رواحہ کا حال پوچھتی ہوئی وہ جو کوئی بھی تھی اس سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں اس سے بے حد اپنائیت محسوس ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رواحہ کے لیے آنسو تھے، وہ رواحہ کے لیے رو رہی تھی اور اس کے لب ہولے، ہولے ہل رہے تھے یقیناً وہ اس کی صحت و زندگی کے لیے دعا کر رہی ہوگی...... تو وہ لڑکی...... انہوں نے سوالیہ نظروں سے عظام کی طرف دیکھا۔

''عظام وہ لڑکی جس سے تم نے میرا تعارف کروایا تھا، کیا یہ وہی لڑکی ہے جس کے لیے ظفری نے دھمکی دی تھی اور کیا اسی لڑکی کو رواحہ پسند کرتا ہے؟''

عظام نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پریشان سا ہو کر انہیں دیکھا

''آپ پلیز پریشان نہ ہوں...... انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کیسے ٹھیک ہو جائے گا، کیا رواحہ اس لڑکی کو پسند کرنا چھوڑ دے گا؟'' انہوں نے محبت کے بجائے پسند کا لفظ دانستہ لگایا...... حالانکہ وہ جانتے تھے کہ رواحہ اس سے محبت کرتا ہے اور وہ لڑکی بھی اس سے محبت کرتی ہے...... وہ آنسو جو اس کی آنکھوں میں تھے، وہ تڑپ جو اس کے پورے وجود سے جھلکتی تھی، محبت کی تڑپ تھی...... یہ آنسو محبت کی دین تھے...... عظام متذبذب سا انہیں دیکھ رہا تھا۔

ان کا جی چاہا اس سے پوچھیں...... عظام یہ محبت اتنی تکلیف دہ، اتنی ظالم کیوں ہوتی ہے۔ میں نے محبت کی تو میرا دامن دکھوں سے اذیت سے اور کرب سے بھر گیا...... اس محبت نے مجھے تنہا اور میرے دل کو ویران کر دیا...... ایسا ویران کہ وہاں جدائیوں کے نوحے گونجتے ہیں...... محبتوں کے بچھڑ جانے کے بین سنائی دیتے ہیں، محبت نے میرے دل کو قبرستان بنا ڈالا ہے اور میرے بیٹے نے محبت کی تو محبت نے اسے لہولہان کر دیا۔

''بابا......'' عظام نے کچھ کہنے کے لیے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تو آئی سی یو سے باہر آتے ثمر حیات کو دیکھ کر وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور بے تابانہ اُن کی طرف بڑھے۔

''وہ کیسا ہے اب...... اس نے آپ سے بات کی...... آنکھیں کھولیں کچھ بتایا...... آپ کو پتا ہے وہاں آئی سی یو میں موجود ایک ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے کو کسی نے گولیاں ماری ہیں۔''

''وہ ٹھیک ہے، ہوش میں ہے۔ اس نے مجھ سے بات بھی کی۔'' ایک بازو اُن کی کمر کے گرد حمائل کرتے ہوئے وہ وہاں ہی نصب بینچ پر بیٹھ گئے اور ہولے، ہولے انہیں تسلی دینے لگے۔ عظام نے ایک اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے آئی سی یو کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ اس کے فون کی بیپ ہوئی۔ اس نے دیکھا سنہری کا نمبر تھا...... اس نے آن کیا دوسری طرف بجل تھی۔

''سوری بجل میں صبح سے تم سے بات نہیں کر سکا۔ دراصل رواحہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور ہم اب بھی اسپتال میں ہیں...... ہمارا ارادہ تھا آج شام آنے کا...... پاپا نے ناشتے پر مجھے کہا تھا کہ میں تمہیں اطلاع دے دوں کہ ہم شام کو آئیں گے لیکن پھر یہ حادثہ ہو گیا۔ رواحہ کی طبیعت جیسے ہی ذرا سنبھلتی ہے میں آپ کو فون کرتا ہوں۔'' اس نے

سجل کی آواز سنتے ہی تفصیل سے بتایا۔
''کوئی بات نہیں...... یوں بھی اماں آج صبح لاہور چلی گئی ہیں...... اچانک ہی کوئی کام آپڑا ہے...... میں نے اس لیے فون کیا کہ بتادوں......''
''اوہ...... کب تک واپس آئیں گی؟'' اس نے اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔
''پتا نہیں......'' سجل نے یک دم ہی فون آف کر دیا لمحہ بھر وہ فون ہاتھ میں پکڑے دیکھتا رہا...... پھر ہولے سے سر جھٹک کر مڑ کر دیکھا...... ثمر حیات اب بابا کے کندھے پر ہاتھ رکھے کچھ کہہ رہے تھے اور اُن کے چہرے پر پہلے جیسا تناؤ اور پریشانی نہ تھی۔ قدرے مطمئن ہو کر وہ آئی سی یو کی طرف بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

''یہ لو اپنا فون......'' سجل نے سنہری کی طرف فون بڑھایا تو سنہری نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
''کیوں...... تم نے بات کیوں نہیں کی۔''
''بس اماں کے لاہور جانے کا ہی بتانا تھا اور کیا بات کرتی۔'' سجل نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''ارے وہی جو دو محبت کرنے والے ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔'' سنہری نے آنکھیں مٹکائیں۔
''دو محبت کرنے والے......'' سجل کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہوگئی۔ ''تم بھی ناں سنہری عجیب باتیں کرتی ہو، ہمارے درمیان بھلا محبت کہاں سے آگئی۔ میں نے اس سے مدد طلب کی اور اس نے ترس کھا کر مجھ سے میری مدد کا وعدہ کر لیا...... اس میں محبت کی کہاں گنجائش ہے؟''
''محبت کی ہی تو گنجائش ہے بی بی، محبت کا بیج اندر کہیں نمو پا رہا ہوتا ہے تو ہمدردی کی کونپل پھوٹتی ہے ہا...... ہا......'' وہ ہنسی۔
''محبت ہمیشہ ہمدردی کی کوکھ سے ہی جنم لیتی ہے۔'' جی ہاں وہ پھر ہنسی۔
''تم نے اتنی کتابیں پڑھیں اور سیکڑوں کتابوں کا ڈھیر اکٹھا کر رکھا ہے۔ دو تین سو کتابیں تو ہوں گی ناں تمہارے پاس لیکن تم نے تو جو سب پڑھا لکھا کنویں میں پھینک دیا۔ تم مانو نہ مانو، وہ تم سے محبت کرتا ہے اور بغیر محبت کے کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا سمجھیں...... خیر یہ بتاؤ کہ کیا کہہ رہا تھا، کیا اس کے باپ نے سچ میں آج آنا تھا؟''
''ہاں...... آنا تو تھا لیکن وہ جو اس کا دوست ہے ناں پروفیسر صاحب کا بیٹا اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔''
''لو جی کر لو گل......'' سنہری نے برا سا منہ بنایا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''اِدھر اماں لاہور چلی گئیں اُدھر پروفیسر کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہوگیا...... غریبوں نے روزے رکھے اور دن ہی بڑے ہوگئے۔''
اس وقت وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سجل دونوں پاؤں صوفے پر رکھے بازو ٹانگوں کے گرد لپیٹے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے اسے دیکھ رہی تھی۔
''سچی میں اتنی خوش ہو رہی تھی کہ عظام اپنے باپ کے ساتھ رشتہ لینے آئے گا تو کیسا انوکھا سا لگے گا۔ ہمارے جیسوں کے گھروں میں بھلا کہاں کوئی رشتہ لے کر آتا ہے، یہ اماں کو بھی ابھی جانے کی سوجھی...... حالانکہ میں نے بتایا بھی تھا اماں کو کہ تمہارے رشتے کے لیے کسی نے آنا ہے دو دن بعد چلی جائیں پر اماں کے پاؤں کے نیچے تو جیسے کسی نے آگ بچھادی تھی۔'' سنہری نے ناک چڑھائی۔
''لیکن اماں اچانک لاہور کیوں چلی گئیں؟'' سجل نے پوچھا۔
''اللہ جانے......'' سنہری نے کندھے اچکائے۔
''لگتا ہے کسی خفیہ مشن پر ہی گئی ہیں۔ لاکھ پوچھا ظہورے سے مگر مجال ہے جو ایک لفظ بھی نکالا ہو منہ

ہے..... ویسے ہزاروں باتیں سن لو دنیا جہان کی لیکن اگر کوئی مطلب کی بات ہو تو منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔'' سنہری کو اکثر ہی ظہورے پر غصہ آیا رہتا۔

''کہیں صاحبزادہ صاحب نے گھر تو خالی کرنے کا نہیں کہہ دیا۔'' سجل کو وہم ہوا۔

''موتیا بھی جب سے مری سے آئی ہے گھر پر ہی ہے..... کہیں اماں نے لاہور واپس جانے کا پروگرام تو نہیں بنالیا اور شاید وہاں کی صورتِ حال کا جائزہ لینے گئی ہوں۔''

''پتا نہیں.....'' سنہری نے کندھے اچکائے۔

''لیکن اگر ایسا ہے تو اچھا ہی ہے ناں، تمہارا کیا دل لگا تھا کراچی میں اور سچ پوچھو تو مجھے بھی کبھی کبھی لاہور بہت یاد آتا ہے۔ اللہ کرے اماں لاہور میں رہنے کا ہی فیصلہ کرلیں۔'' بات کرتے، کرتے اس نے سجل کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ایک دکھ بھری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

''او..... ہو.....'' اس نے اپنے رخسار پر خود ہی چپت لگائی۔

''لو بھلا اب تمہارا کہاں دل لگے گا لاہور میں..... یہاں تمہارا اعظام جو ہے۔''

''تمہارا اعظام..... تمہارا اعظام.....'' دل کے اندر خوشگوار سی دھڑکنوں نے ادھم مچادیا اور خوشنما آنکھوں سے سنجیدگی کے بجائے ایک نرم محبت بھرا تاثر جھلکنے لگا۔

''کیا ایسا ہوگا..... کیا کبھی میں پورے یقین اور اعتماد سے کہہ سکوں گی میرا اعظام۔'' اپنے ہی خیالات سے گھبرا کر اس نے سنہری کی طرف دیکھا جو بہت دلچسپی سے اس کے چہرے کی بدلتی کیفیات دیکھ رہی تھی، اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے چٹکی بجائی۔

''سن..... بجو ذرا فون تو ملا اسے۔'' اور ساتھ ہی اس نے پاس پڑا فون اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

''کیوں.....؟'' سجل نے فون نہیں پکڑا۔

''یونہی گپ چپ لگا اور اسے کہہ باہر ڈنر شنر پر چلنے کی دعوت دے۔ ذرا گھوم پھر آ اس کے ساتھ..... ویسے بھی اماں تو ہیں نہیں۔''

''میں..... اس کے ساتھ باہر جاؤں؟ نہیں، یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے۔'' سجل نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

''کیوں..... کیوں نہیں ہوسکتا؟'' سنہری نے آنکھیں مٹکائیں۔

''ست بسم اللہ..... کر کے آئے گا تو ایک بار کہہ کر تو دیکھ۔''

''نہیں، مجھے اس کے ساتھ کہیں باہر نہیں جانا۔'' سجل کا لہجہ حتمی تھا اور ہلکی سی سختی لیے ہوئے تھا جبکہ اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور کچھ دیر پہلے والی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔

''اچھا تو پھر گھر بلا لو..... ذرا اندازہ لگاتے ہیں کتنے پانی میں ہے، کہیں بقول اماں کے پھٹیچر ہی نہ ہو۔''

''تمہیں بتایا تو ہے میں نے پروفیسر صاحب کے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے..... وہ اسپتال میں ہے۔''

''تو دو دن بعد بلا لینا۔'' سنہری نے فوراً ہی دوسرا حل پیش کردیا۔ ''بھئی پتا تو چلے کچھ اس کے بارے میں.....''

''تمہیں کیا لگتا ہے سنہری کہ وہ کوئی ایسا ویسا غریب، غربا اور بیچارہ سا ہے۔''

''نہیں، خیر ایسا تو نہیں لگتا بلکہ شکل صورت سے تو وہ کوئی شہزادہ لگتا ہے لیکن کبھی، کبھی شہزادے بھی بالکل خالی ہاتھ ہوتے ہیں۔ ٹھن ٹھن گوپال۔'' اس نے تالی بجائی اور ہنسی۔

''کیا مطلب.....'' سجل اس کی بات نہ سمجھ سکی تھی، کبھی سنہری ایسے ہی عجیب وغریب جملے بولتی تھی۔

''مطلب..... مفلس، غریب، خالی جیب.....''

''کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے سنہری؟'' سجل نے پوچھا تو سنہری کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''نہیں خیر فرق تو نہیں پڑتا...... تم معتبر ہو جاؤ گی۔ بھلے وہ تمہیں کسی جھونپڑے میں رکھے اور کھانے کو دو وقت پیٹ بھر کھانا بھی نہ کھلا سکے۔''

''اور مجھے معتبر ہی تو ہونا ہے سنہری۔'' سجل کی خوب صورت آنکھوں میں افسردگی کا غبار سا پھیلا تھا...... خواب تو سنہری دیکھتی تھی گھر گرہستی کے خواب اور تعبیر اسے ملنے والی تھی۔

''کیا واقعی اسے تعبیر مل جائے گی۔'' اس نے مضطرب سا ہو کر گھٹنوں کے گرد سے بازو ہٹائے...... پاؤں نیچے رکھے اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

''کیا وہ عظام کے ساتھ خوش رہ سکے گی۔ سر اٹھا کر جی سکے گی یا ساری زندگی اس کے احسان کے بوجھ تلے دبی سر جھکائے گزار دے گی۔'' وہ یک دم ہی بہت مضطرب اور بے چین ہو گئی تھی۔ شاید اس نے غلط کیا اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے خود کو ہمیشہ کے لیے اپنی نظروں میں گرا لیا تھا اور عظام کی نظروں میں بھی......'' مجھے عظام سے کہہ دینا چاہیے کہ وہ صرف ایک مذاق تھا اور مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔'' اس نے آنکھیں کھولیں اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور سینٹر ٹیبل پر پڑے سنہری کے فون کو دیکھا اور یک دم کھڑی ہو گئی۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے، مجھے ابھی اس سے کہہ دینا چاہیئے اسے بتا دینا چاہیے۔'' اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اسے لگا جیسے اس کا دل نیچے کہیں پاتال میں گر گیا ہو۔ وہ جیسے نڈھال سی ہو کر واپس صوفے پر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا سجو......؟'' سنہری اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

''کچھ نہیں......'' اس نے نچلے لب کو دانتوں تلے کاٹا۔

''کچھ تو ہے جانو......'' سنہری نے اس کی آنکھوں میں تیزی سے پھیلتی نمی کو دیکھا۔

''وہ۔ مجھے لگتا ہے سنہری میں نے غلط کیا ہے۔'' وہ اب بھی نچلا لب دانتوں تلے کاٹ رہی تھی۔

''بتاؤ کیا غلط کیا ہے تم نے سجو......؟'' سنہری نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''یہی...... عظام کو یہ کہہ کر وہ مجھ سے شادی کرلے۔''

''اس میں ایسا کیا غلط ہے سجو......؟'' سنہری کی سوالیہ نظریں اس پر جمی تھیں۔

''سب...... سب غلط ہے مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' آنکھوں میں پھیلتی نمی آنسو بن کر رخساروں پر ڈھلک آئی۔

''کچھ غلط نہیں کیا تم نے بے وقوف۔'' سنہری کے لہجے میں بڑی بہنوں کا سا ناصحانہ رنگ اتر آیا۔

''اپنے لیے اچھی اور باعزت زندگی گزارنے کی کوشش کرنا ہر انسان کا حق ہے...... میرا اور تمہارا بھی...... دیکھ لینا مجھے اگر کوئی ایسا مل گیا ناں تیرے عظام جیسا تو میں اسے پانے کی کوشش ضرور کروں گی بھلے اس کے قدموں میں گرنا پڑے۔''

''تیرے عظام......'' پر اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔ اس بے ترتیبی میں بھی ایک خوشگوار سا ردھم تھا۔ اس کے رخساروں پر گلابیاں سی بکھریں تو سنہری اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

''اسی لیے تو کہتی ہوں کہ دو چار ملاقاتیں کر اس سے اور اس کے دل پر تیرا جو نقش بنا ہے اسے اتنا گہرا کر دے جیسے پتھر پر کھدا ہوا ناکہ پانی پر لکھی تحریر...... تو اس پر ایسا تاثر چھوڑ کر اسے لگے جیسے تیرے بنا زندگی اس کے لیے بیکار ہے۔'' سجل حیرت سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ سنہری نے کبھی کوئی کتاب، کوئی ناول، کوئی افسانہ نہیں پڑھا تھا لیکن وہ اکثر ایسی ہی باتیں کرتی تھیں جیسے ہزاروں کتابیں گھول کر پی رکھی ہوں۔

''تو میری جان اس سے ملتی رہ...... اور......'' سیڑھیوں سے اترتی موتیا کو دیکھ کر اس نے ایک دم بات ادھوری چھوڑ دی اور اس کی طرف دیکھنے لگی جس کی رنگت زرد ہو رہی تھی اور آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے

تھے۔ وہ ریلنگ کا سہارا لیتی ہوئی بہت آہستہ، آہستہ نیچے اتر رہی تھی۔

''موتی کیا ہوا ہے'' سنہری ایک دم ہی اٹھ کر اس کی طرف بڑھی۔ بے شک اس کی موتیا سے اکثر تو، تو میں، میں ہوتی رہتی تھی لیکن اس کے دل میں موتیا کے لیے بہت پیار تھا'' موتی کیا ہوا ہے تجھے...... جب سے مری سے آئی ہے تیری حالت ایسی ہو رہی ہے۔''

''بخار نہیں اتر رہا سنہری۔'' موتیا کے لہجے میں تھکن تھی...... سنہری لمحہ بھر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

''بخار ہی ہے ناں موتی یا کچھ اور......؟''

''بخار ہی ہے سنہری...... لگتا ہے بخار ہڈیوں میں بیٹھ گیا ہے۔ لگتا ہے نمونیہ ہو گیا ہے، سینے میں درد بھی رہتا ہے۔''

''یا اللہ...... موتیا تم اتنے دنوں سے اس بخار کو لے کر بیٹھی ہوئی ہو...... ڈاکٹر کی طرف نہیں گئیں اور یہ اماں بھی تمہیں لے کر نہیں گئیں۔'' سنہری نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''نہیں تو، اماں نے تو کہا تھا کہ موراں کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کی طرف چلی جاؤں لیکن میں نے ہی منع کر دیا کہ موراں خود ہی میری حالت بتا کر لے آئے گی اور موراں دوائی لے تو آئی تھی پر دوائی کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے بخار کم ہوتا ہے کچھ دیر بعد پھر ویسے ہی بدن ٹوٹنے لگتا اور جسم تپ جاتا ہے۔''

''تم بھی عجیب احمق ہو موتیا، بھلا بتانے سے ڈاکٹر کو کیا پتا چلا ہوگا کہ کیسا بخار ہے، ملیریا ہے، ٹائیفائیڈ ہے یا پھر...... یا اللہ۔'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھا۔

''کہیں ڈینگی ہی نہیں ہو۔'' سنہری کو ٹی وی بہت دیکھنے سے ڈینگی سے کافی آگہی تھی۔

''نہیں سنہری، مجھے لگتا ہے مری میں ٹھنڈ لگ گئی ہے مجھے۔'' موتیا نے تسلی دینے کے انداز میں سنہری کے بازو پر ہاتھ رکھا تو سنہری چلائی۔

''ہائے موتیا تجھے تو بہت تیز بخار ہے، تیرا بدن تو جل رہا ہے۔ چل ڈاکٹر کے پاس، میں تیرے ساتھ چلتی ہوں۔''

''میں ڈاکٹر کی طرف ہی جا رہی ہوں موراں کے ساتھ...... موراں نے شیدے کو بھیجا ہے ٹیکسی لینے آتا ہی ہوگا۔''

''تو اپنے صاحبزادہ صاحب سے کہہ ناں تجھے بھی ایک گاڑی لے دیں...... بڑی نہ سہی چھوٹی سی...... نئی نہ ہو پرانی ہی سہی۔''

سنہری کا ذہن یوں ہی لمحوں میں پلٹا کھاتا تھا۔ موتیا کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ سجل بھی تشویش سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر بکھرنے والی مسکراہٹ نے جیسے اس کا دل مٹھی میں لے لیا تھا۔ موتیا نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا تھا لیکن اسی ایک مدھم سی مسکراہٹ میں جو لمحہ بھر کے لیے اس کے لبوں پر نمودار ہو کر معدوم ہو گئی تھی نہ جانے کتنی کہانیاں چھپی ہوئی تھیں۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن یہ مسکراہٹ بہت کچھ کہہ رہی تھی۔

''تم اپنا خیال نہیں رکھتی ہو موتیا۔'' سجل نے اس کی مسکراہٹ کے حصار سے خود کو نکالنے کی کوشش کی۔

''جی ہی نہیں چاہتا سجو اپنا خیال رکھنے کا۔'' وہ ہولے، ہولے چلتی ہوئی سجل کے قریب آئی اور کچھ دیر یونہی اسے دیکھتی رہی پھر دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں اس کا چہرہ لیتے ہوئے اس کی پیشانی چومتے ہوئے سرگوشی کی۔

''سجو عظام کو مت کھونا۔''

سجل ساکت سی ہو گئی تو کیا سنہری نے وہ سب کچھ موتیا کو بتا دیا ہے جو اس نے سنہری کو بتایا تھا اور ابھی یہ کل رات کی ہی تو بات تھی کہ وہ بے اختیار سنہری کو سب بتا بیٹھی تھی۔ عظام کا پارک میں ملنا اور اس کا اس سے شادی کے لیے کہنا...... سجل نے شاکی نظروں سے سنہری کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر موراں کو دیکھنے لگی جو دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کچن سے نکلی تھی۔

''چلو موتیا، شیدا ٹیکسی لے آیا ہے۔'' غالباً اس نے کچن کی کھڑکی سے اسے دیکھا تھا۔

''میں بھی چلوں؟'' سنہری نے پوچھا۔

''شیدا...... ! اور موراں تو ہیں ناں...... تم کیا کرو گی۔'' اپنی چادر درست کرتے ہوئے موتیا نے مڑ کر سنہری سے کہا...... وہ لوگ عموماً جب پبلک پلیسز پر جاتی تھیں تو چادر لے لیتی تھیں۔ وہاں لاہور میں تو موتیا سنہری اور شاہجہان تینوں ہی باہر نکلتیں تو برقع لیا کرتی تھیں۔ لیکن یہاں کراچی آ کر انہوں نے برقع اوڑھنا چھوڑ دیا تھا کبھی کبھار باہر جاتے ہوئے موتیا اور سنہری چادر لے لیتی تھیں۔

موراں اور موتیا باہر چلی گئیں۔ سنہری بھی ان کے پیچھے گیٹ بند کرنے گئی تھی۔ تجل ہاتھ گود میں رکھے ساکت بیٹھی رہی...... سنہری گیٹ بند کر کے واپس آئی...... اور تجل کی طرف دیکھا جس کی نظروں میں اب بھی شکایت تھی اور چہرے سے ناگواری جھلکتی تھی...... وہ اسے دیکھ کر مدھم سا مسکرائی۔

''میں نے موتیا کو کچھ نہیں بتایا تجو...... شاید اماں نے ذکر کیا ہو آخر اس روز میں نے اماں سے اتنی بحث جو کی تھی کہ اگر عظام کے پاپا آئیں رشتہ لینے تو وہ ہاں کر دیں۔'' سنہری نے تو جیسے اس کے اندر جھانک لیا تھا۔ اور کبھی کبھار سنہری کے اس طرح کوئی بات بوجھ لینے پر وہ بہت حیران ہوتی تھی اور اب بھی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تمہیں کیسے پتا چلا سنہری کہ میں نے تمہارے متعلق ایسا سوچا کہ تم نے موتیا کو بتایا ہوگا۔''

''تمہاری نظروں نے مجھے بتا دیا۔ اتنی ناراضی سے دیکھ رہی تھیں مجھے، کیا تم نے سنہری کو پیٹ کا اتنا ہلکا سمجھا...... تم سمجھو تم نے جو بات مجھ سے کی تھی، میں اسے بھول بھی گئی۔ مانو تم نے اسے کسی اندھے کنوئیں میں پھینک دیا ہو۔''

تجل نے سر ہلایا بولی کچھ نہیں تھی تاہم وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

''اب کس سوچ میں پڑ گئی ہو، چلو اٹھو منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلو باہر کہیں گھومنے چلتے ہیں، تمہارے تیار ہونے تک موتیا بھی آ جائے گی۔''

''نہیں سنہری، کہیں بھی جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔''

''اچھا چلو ایسے ہی چلتے ہیں سامنے پارک تک اُدھر سے آئس کریم کھا کر......'' لیکن ڈور بیل کی تیز آواز سے اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

''یا اللہ خیر اس وقت کون آ سکتا ہے...... ہائے کہیں موتیا اور موراں تو واپس نہیں آ گئیں...... ابھی تو نکلی تھیں...... شاید کوئی چیز گھر رہ گئی ہو...... پر کیا...... شاید فون لینا ہو موتیا نے...... ڈاکٹر کے پاس جا رہی تھیں...... ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' وہ خود ہی اندازے لگاتے ہوئے لاؤنج سے نکل گئی۔ اس وقت گھر میں سوائے تجل کے اور اس کے کوئی نہیں تھا۔ اسے ہمیشہ اپنے اندازوں پر سو فی صد یقین ہوتا تھا اس لیے بغیر پوچھے ہی چھوٹا گیٹ کھول دیا لیکن باہر ایک اجنبی کو دیکھ کر ذرا سا حیران ہوئی۔

''جی کس سے ملنا ہے؟''

''شاہجہان...... شاہجہان بیگم سے۔''

''اماں سے؟'' اس نے اب کے بغور اجنبی کی طرف دیکھا وہ جو کوئی بھی تھا اپنے لباس اور انداز سے کوئی بڑا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اس کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی قیمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی اور پھر اس کے عقب میں موجود گاڑی پر نظر ڈالی جو یقیناً اس کی ہی تھی۔ بی ایم ڈبلیو...... خاصی قیمتی گاڑی تھی۔ صاحبزادہ صاحب کے پاس بھی ایسی ہی ایک گاڑی تھی۔ وہ ایک دم گیٹ پر موجود شخص سے مرعوب سی ہو گئی۔

''کیا یہ شاہجہان بیگم کا گھر نہیں ہے؟''
''ان کا ہی گھر ہے۔''اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
''لیکن وہ گھر پر نہیں ہیں۔''
''کہاں ہیں اور کب تک گھر آجائیں گی؟''اجنبی نے کلائی موڑ کر وقت دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''وہ یہاں نہیں ہیں، لاہور گئی ہوئی ہیں......اور پتا نہیں کب آئیں گی......بتا کر نہیں گئیں۔''
''اچھا......کوئی رابطہ نہیں ہے آپ کا اُن سے؟''اجنبی اب سنہری کی طرف دیکھ رہا تھا۔
''ہاں......اماں تو جب سے لاہور گئی ہیں ایک بار بھی فون نہیں کیا......لیکن آجائیں گی تین چار روز تک جاتے ہوئے جلدی آنے کا کہا تھا۔''سنہری پُرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
''تم موتیا ہو؟''اجنبی نے جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے پوچھا۔
''نہیں......میں سنہری ہوں۔''
''اچھا......دراصل بیس اکیس سال پہلے جب میں شاہجہان بیگم سے ملا تھا تو موتیا تب یہی کوئی دس گیارہ سال کی ہوگی اور تم......تمہیں میں نے نہیں دیکھا تھا تب......لیکن شاہجہان نے بتایا تھا کہ اس کی موتیا سے چھوٹی بھی ایک بیٹی ہے۔''
''آپ آئیں ناں......اندر بیٹھیں کوئی چائے پانی۔''سنہری نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا اور سوچا۔''پچاس سال کا تو ضرور ہوگا لیکن زبردست پرسنالٹی ہے......اور اماں بھی تو بیس سال پہلے اتنی بڈھی......بے ڈھنگی نہیں ہوں گی۔''اپنی سوچ پر خود بخود ہی اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
''نہیں......شکریہ......دو چار روز میں پھر چکر لگاؤں گا۔تمہاری چائے ادھار رہی۔''وہ واپس مڑا۔
''سنیں، سنیں......!''سنہری نے بے اختیار اسے آواز دی۔
''تم......آپ حاتی دادا ہو؟''
''نہیں......''اس نے مڑ کر اسے دیکھا جو بے حد تجسس سے اسے دیکھ رہی تھی۔
''خانو دادا......؟''
''نہیں......''وہ مسکرایا۔''میرا نام بابر نوید ہے۔جب شاہجہان بیگم آئیں تو انہیں بتا دینا کہ بابر نوید آیا تھا......دوبارہ پھر آؤں گا جلد ہی۔''
وہ پھر مڑ گیا تھا وہ آنکھیں پھاڑے اسے جاتے دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ اس شاندار گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی آگے بڑھ گئی تب گیٹ بند کر کے وہ تقریباً بھاگتی ہوئی لاؤنج میں آئی۔
''بجو، بجو......''
''کیا ہوا......؟''سجل گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔''موتیا تو ٹھیک ہے ناں کیا وہ واپس آئی تھی؟''
''نہیں......''اس نے نفی میں سر ہلایا۔
''پھر گیٹ پر کون تھا سنہری؟''سجل نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔''کیا کوئی ڈاکو؟''
موراں پتا نہیں کدھر، کدھر سے ڈاکوؤں کے قصے سن کر آتی تھی اور پھر گھر آکر بتاتی
''نہیں......''سنہری پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے دھپ سے صوفے پر بیٹھ گئی۔
''وہ......کوئی بابر نوید تھا اور اماں سے ملنے آیا تھا۔''
''تو پھر......؟''سجل کو سنہری کی اس کیفیت پر حیرت ہوئی اور وہ اپنی جگہ پر واپس بیٹھ گئی جبکہ سنہری اپنی

انگلیوں پر کوئی حساب لگا رہی تھی۔

''بیس اکیس سال پہلے......'' اس نے زیرِلب دُہرایا اور تجل سے پوچھا۔

''تمہاری عمر انیس سال ہے ناں......؟''

''ہاں تقریباً......!''

''تو فرض کرو وہ بیس سال پہلے اماں سے ملنے آیا تھا اور اب!''

وہ تھوڑا سا تجل کی طرف جھکی، اس کی آنکھیں بے تحاشا چمک رہی تھیں۔

''بجو...... یہ جو بابر نوید ہے ناں مجھے لگتا ہے یہ...... تم جاننا چاہتی تھیں کہ ناں کہ تمہارا باپ کون ہے، تو بس سمجھ لو کہ اللہ شکر خورے کو شکر دے ہی دیتا ہے...... بابر نوید خود ہی بیس سال بعد اماں سے ملنے چلا آیا...... میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ اسے کہوں اماں تو گھر پر نہیں ہیں لیکن اصل میں تم بیس سال بعد جس کی تلاش میں آئے ہو وہ تو اندر بیٹھی ہے تمہاری بیٹی تجل......''

''توبہ ہے سنہری، تم کیسے منٹوں میں کہانی گڑھ لیتی ہوں، تمہیں تو کہانی نگار ہونا چاہیے تھا۔'' تجل جھنجلائی۔

''اماں سے تو بیس برس پہلے نہ جانے کتنے لوگ ملے ہوں گے بیس برس پہلے تو بقول اماں کے ان کے چوبارے پر خوب رونق ہوتی تھی، سیکڑوں لوگ آتے تھے۔''

''ہاں لیکن یہ بندہ مجھے لگتا ہے جو ہو نہ ہو یہ ہی تمہارا......''

''خواہ مخواہ فضول اندازے مت لگاؤ سنہری۔''

''نہیں سچ میں بجو، اس کی آنکھیں بالکل تمہاری طرح تھیں...... نہیں آنکھیں نہیں ہونٹ...... یا پھر ناک بلکہ......''

''سنہری......'' تجل نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کل تک تو تم حاتی دادا کے متعلق انکشاف کررہی تھیں اور آج تمہیں یہ......''

''میں نہیں حاتی دادا کے متعلق تو ظہورا کہتا تھا...... ذرا سوچو تو تجل بیس سال پہلے یہ شخص اماں سے ملا تھا اور پھر نہیں ملا اور اب بیس سال بعد بھلا کیوں اماں کو ڈھونڈتا ہوا چلا آیا اس میں کچھ تو بھید ہے ناں۔''

تجل نے سر تھام لیا...... اب بھلا وہ سنہری سے کیا کہتی...... وہ تو ایسی ہی تھی...... اپنے اندازوں پر اسے ہمیشہ ہی ہنڈرڈ پرسن یقین ہوتا تھا۔

''بجی کتنا مزہ آئے گا ناں جب وہ تمہیں اپنے گھر لے جائے گا۔ اتنی شاندار گاڑی تھی اس کے پاس اور اتنی قیمتی گھڑی باندھ رکھی تھی اس نے اور یقیناً اس کا گھر بھی اتنا ہی شاندار ہوگا۔ بجی تیرے تو مزے ہو جائیں گے اور عظام......'' وہ مزے سے اپنی ہی باتوں سے محظوظ ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی جب اس کے فون کی بیل ہونے لگی۔

''اُف... کس کا فون ہے۔'' وہ اٹھی۔ ''ہائے کہیں موتیا کا نہ ہو۔'' اس نے فون اٹھا کر دیکھا اور تجل کی طرف بڑھا دیا۔

''لو تمہارا فون ہے، عظام کا۔'' اس نے فون اس کی طرف بڑھایا اور وہ فون ہاتھ میں لیے خالی، خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی یہاں تک کہ بیل آنا بند ہوگئی۔

''تم نے کال کیوں اٹینڈ نہیں کی تجل؟'' سنہری نے پوچھا۔

تجل خاموش ہی رہی...... فون ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا...... اور وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

''ابھی اسے نظر انداز نہ کرو...... ابھی تم اسے بتاؤ کہ تم اس سے زیادہ بے تاب رہتی ہو اس سے بات کرنے کے لیے۔'' سنہری کو اماں کا سکھایا ہوا سبق یاد آیا تھا۔ فون ایک بار پھر بجنے لگا تھا...... اور تجل فون ہاتھ میں لیے ساکت بیٹھی تھی جیسے بے جان مجسمہ......

”لاؤ مجھے دو، میں بات کرتی ہوں۔“
سنہری نے اس کے ہاتھ سے اپنا موبائل لیا لیکن تب تک ایک بار پھر بیل آنا بند ہوگئی تھی...... سنہری فون ہاتھ میں لیے، لیے لاؤنج سے باہر نکل گئی جبکہ نجل نے سر صوفے کی پشت سے ٹیکتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں اور انگوٹھے سے اپنی کنپٹی کو ہولے، ہولے دبانے لگی۔

☆☆☆

عظام نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے فون کو دیکھا۔
”آخر نجل فون کیوں اٹینڈ نہیں کررہی...... اس وقت بھی اس نے فوراً ہی فون بند کردیا تھا اور اب بھی وہ ریسیو نہیں کررہی تھی۔ کہیں وہ اس بات پر خفا تو نہیں ہوگئی کہ میں حسبِ وعدہ آج پاپا کے ساتھ ان کے گھر نہیں جاسکوں گا لیکن نہیں وہ تو خود کہہ رہی تھی کہ اس کی اماں لاہور گئی ہوئی ہیں اور اس نے شاید یہی بتانے کے لیے فون بھی کیا تھا پھر بھلا وہ کیسے ناراض ہوسکتی ہے۔ شاید وہ بزی ہے یا...... پھر فون بھی تو سنہری کا ہے ناں...... ہوسکتا ہے سنہری نے فون کہیں اِدھر اُدھر رکھا ہوا ہو اور خود کہیں کام میں مصروف ہو...... میں اس سے کہوں گا کہ وہ اپنا ایک الگ فون ضرور لے لے بلکہ میں خود ہی اسے گفٹ کردوں گا۔“ دل ہی دل میں فیصلہ کرتے ہوئے اس نے سوچا کہ وہ ایک بار پھر اس سے بات کرنے کی کوشش کرلے...... ابھی اس نے نمبر ملانے کے لیے فون ان لاک کیا ہی تھا کہ ثمر حیات نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اس نے مڑ کر دیکھا۔
”پاپا آپ!“
”میں جارہا ہوں، بہت ضروری کام ہے ورنہ نہ جاتا۔ پھر چکر لگاؤں گا۔ ابھی تو ممتاز خان میرے ساتھ جارہا ہے لیکن وہ سب کے لیے کھانا وغیرہ لے کر واپس آجائے گا۔ تم لوگوں کے دوست وغیرہ بھی ہیں...... میں نے کینٹین پر چائے کے لیے کہہ دیا ہے...... وہ روم میں ہی بھجوادیں گے۔ ممتاز خان اُدھر ہی رہے گا باہر گاڑی میں کوئی بھی بات ہو تو......“
”ممتاز خان کی کیا ضرورت ہے پاپا...... جواد ہے اور ایک اور کلاس فیلو بھی ابھی آیا ہے۔ میں اور خدا بخش بھی ہیں...... بابا ہیں۔“ اس نے ثمر حیات کی بات کاٹی۔
”کچھ بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ویسے تو میں نے بات کرلی ہے پھر بھی اگر کوئی تھانے سے آجائے تو ممتاز خان بات کرلے گا اور رواحہ ابھی تو مسکن دواؤں کے زیرِ اثر سو رہا ہے لیکن جب جاگے تو اسے سمجھا دینا کہ اسے کیا بیان دینا ہے۔“
”یہی ناں پاپا کہ وہ حملہ آواروں کو نہیں جانتا نامعلوم لوگ تھے۔“ اس کے لہجے میں غیر ارادی طور پر ہلکا سا طنز در آیا تھا لیکن ثمر حیات نے اگنور کردیا۔
”اور پروفیسر صاحب کو میں نے کمرے میں بھیج دیا ہے، وہ بہت ڈسٹرب ہیں۔ تم ڈاکٹر سے پوچھ کر کھانے کے بعد انہیں کوئی سکون آور ٹیبلیٹ دے دینا۔ کچھ دیر سو جائیں گے تو بہتر محسوس کریں گے اور اپنا بھی خیال رکھنا...... ویسے تمہارا کیا پروگرام ہے، رات کو گھر آؤ گے یا اُدھر ہی رکنا ہے؟“ ثمر حیات نے بات مکمل کرکے پوچھا۔
”پاپا میرا خیال ہے کہ بابا اور خدا بخش کو گھر بھیج دیں گے...... جواد اور میں اِدھر ہی رکیں گے۔“ عظام نے اپنا ارادہ بتایا۔
”اوکے سن......“ ثمر حیات نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور اسے محتاط رہنے کی تاکید کرتے ہوئے چلا گیا۔ عظام انہیں وزیٹرز روم سے گزرتے اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر انٹرنس کی طرف جاتے دیکھتا رہا یہاں تک ثمر حیات اس کی

نظروں سے اوجھل ہو گیا تو بجل کو دوبارہ فون کرنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے وہ رواحہ کے لیے لیے گئے روم کی طرف بڑھا...... دروازہ نیم وا تھا وہ اندر داخل ہوا...... پیشنٹ بیڈ پر خدا بخش ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا جبکہ دائیں طرف دیوار کے ساتھ لگے صوفہ کم بیڈ پر بابا آنکھوں پر ہاتھ رکھے نیم دراز تھے۔ آہٹ پر انہوں نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔

''بابا آپ پلیز لیٹے رہیں۔'' عظام نے انہیں اٹھنے سے منع کیا لیکن وہ اٹھ کر بیٹھ چکے تھے اور اب عظام کی طرف دیکھا۔

''تمہارے پاپا چلے گئے؟''

''جی انہیں کسی ضروری کام سے جانا تھا۔ فارغ ہو کر پھر چکر لگائیں گے۔'' عظام ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''تمہارے پاپا بہت اچھے انسان ہیں عظام اور انہیں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ میں ان کی گفتگو، اخلاق اور ان کی محبت سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ میرا رواحہ ٹھیک ہو جائے تو پھر انشاء اللہ ان سے ملاقات کے لیے تمہارے گھر آؤں گا۔''

''جی ضرور......'' عظام مدھم سا مسکرایا...... اور انہوں نے خدا بخش کی طرف دیکھا جو اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''کہیں جا رہے ہو کیا؟''

''جی صاحب عظام ہے ناں آپ کے پاس تو میں کچھ دیر کے لیے گھر جاؤں گا سب کے لیے کھانا وغیرہ لے آؤں۔''

''نہیں چاچا اس کی ضرورت نہیں ہے۔ پاپا، ممتاز خان کے ساتھ کھانا بھجوا رہے ہیں...... آپ بھی لیٹ جائیں آرام کریں۔''

''آرام کیسے کروں عظام صاحب، دل کو کسی پل چین نہیں ہے...... بس رواحہ صاحب کی شکل آنکھوں کے آگے سے ہٹتی نہیں ہے۔ کیسے آنکھیں بند کیے بے بس سے پڑے ہیں...... اللہ ان ظالموں سے سمجھے۔''

''رواحہ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا چاچا...... آپ دعا کرتے رہیں اور پریشان نہ ہوں۔'' عظام نے خدا بخش کو تسلی دی۔ خدا بخش دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گیا...... عظام نے رواحہ کے بابا کی طرف دیکھا جو پھر بہت پریشان نظر آنے لگے تھے۔

''بابا، رواحہ اب ٹھیک ہے آپ پریشان کیوں ہیں؟'' عظام نے اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔

''مسکن دواؤں کے زیر اثر غنودگی میں ہے، امید ہے رات تک اسے روم میں منتقل کر دیں گے اور انشاء اللہ دو چار دن تک فارغ کر دیں گے۔ ابھی جواد اس کے پاس ہی ہے۔ ایک سے زیادہ افراد کو تو آئی سی یو میں نہیں رہنے دیتے باہر دوسرے دوست بیٹھے ہیں...... کچھ دیر تک میں چلا جاؤں گا...... آپ...... ریلیکس ہو جائیں پلیز......'' عظام نے کئی بار کے کہے ہوئے الفاظ پھر دہرائے تھے۔

''جانتا ہوں، انشاء اللہ رواحہ ٹھیک ہو جائے گا لیکن اس کے بعد کیا ہو گا عظام...... جن لوگوں کو اس نے دشمن بنا لیا ہے اگر انہوں نے دوبارہ رواحہ کو......'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی اور بے بسی سے عظام کی طرف دیکھا۔ لحہ بھر کو تو عظام خاموش ہو گیا لیکن پھر اس نے انہیں تسلی دی۔

''انشاء اللہ اب ایسا نہیں ہو گا۔ رواحہ ایک بار ٹھیک ہو جائے تو پھر سوچتے ہیں کچھ۔''

''کیا حل ہو سکتا ہے اس کا؟'' انہوں نے دلگرفتگی سے کہا۔

''تمہارے پاپا کہتے ہیں اس کا بہترین حل یہ ہے کہ رواحہ کو اور تمہیں کچھ عرصے کے لیے باہر بھجوا دیں...... یہ کچھ کتنے عرصے پر محیط ہو گا عظام، میں نہیں جانتا لیکن میں کیسے اتنا عرصہ رواحہ کے بغیر رہ پاؤں گا۔ تم نہیں جانتے، تمہیں نہیں پتا، میں جو یہ اپنے قدموں پر کھڑا ہوں اور زندگی کے بازو میں بازو ڈالے چل رہا ہوں تو صرف اس لیے

کہ میرے ساتھ رواحہ ہے...... زندگی میرے اندر مر چکی تھی۔ عظام میں تو اپنے وجود کے لاشے کو صرف اس لیے گھسیٹ رہا تھا کہ ابھی باغِ رضوان میں زندگی کے درخت سے میری زندگی کا پتا نہیں ٹوٹا تھا اور مجھے اس وقت تک اس بے جان لاشے کو گھسیٹنا تھا جب تک پیغام اجل نہ آجاتا۔ میں تو فرشتۂ اجل کا منتظر تھا لیکن اللہ نے مجھے رواحہ دے دیا۔ اور میرے اندر جیسے زندگی کی چنگاری جل اٹھی، مجھے زندہ رہنے کا جواز مل گیا...... میں تو رواحہ کو دیکھ، دیکھ کر سانس لیتا ہوں عظام، وہ دور چلا گیا تو میری سانسیں تو میرے سینے میں ہی گھٹ جائیں گی۔''

وہ ہولے، ہولے جیسے خواب کے سے عالم میں بول رہے تھے اور ان کے الفاظ جیسے عظام کے دل کو گرفت میں لیے تھے۔ رواحہ صحیح تو کہتا تھا کہ وہ بابا کا عشق اور بابا اس کا عشق ہیں...... اتنی شدید محبت کو بھلا اور کیا نام دیا جاسکتا ہے۔

''ہم کہیں نہیں جائیں گے بابا...... اگر ہماری زندگی ہے تو کوئی ہمارا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔ لیکن اگر زندگی ختم ہوگئی اور سانسیں پوری ہوگئیں تو سات سمندر پار جاکر بھی موت سے نہیں بچ سکیں گے۔'' اور عظام کے تسلی بھرے لفظوں سے کچھ دیر کے لیے ہی سہی اُن کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا...... جو لکھا ہے وہ ٹل نہیں سکتا...... نہ ایک سانس کم نہ ایک سانس زیادہ لیکن تمہارے پاپا تو جیسے پختہ ارادہ کیے بیٹھے ہیں کہ تمہیں اور رواحہ کو جتنی جلدی ممکن ہو سکے باہر بھجوادیں۔''

''ہاں، ان کا دل بھی تو ایک محبت کرنے والے باپ کا دل ہے ناں بابا جو اپنے بچوں کو...... (پروٹیکشن) تحفظ دینے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔ بھلے اسے بچوں کی دوری ہی کیوں نہ برداشت کرنا پڑے تو پاپا بھی ایسا ہی سوچتے ہیں شاید۔''

''باپ کا دل......!'' انہوں نے زیرِ لب کہا اور انہیں بابا جان یاد آگئے۔ کیسے، کیسے تڑپا تھا اُن کا دل ان کی زندگی کے المیے پر...... کتنے نڈھال اور کمزور ہوگئے تھے وہ لیکن ان دنوں انہیں خیال ہی کب تھا کہ وہ ان کی طرف دیکھتے اور ان کی حالت پر غور کرتے، وہ تو خود بکھر گئے تھے، ٹوٹ گئے تھے اور بابا جان ہر لمحہ انہیں سنبھالنے کی سعی کرتے رہتے تھے وہ کہیں کھو سے گئے۔

اس روز جب انہوں نے چندا کو تیسری طلاق بھجوائی تھی تو جیسے کسی نے اُن کا دل سینے سے نوچ کر پھینک دیا تھا۔ سب کچھ ختم ہوگیا تھا...... سب امیدیں، گمان، آس، ہاں سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ کچھ بھی تو باقی نہیں بچا تھا۔ واپس پلٹنے کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ چندا ہمیشہ کے لیے ان کی زندگی سے نکل گئی تھی...... لیکن کیا وہ واقعی ان کی زندگی سے نکل گئی تھی وہ تو اب بھی ان کی زندگی میں موجود تھی ان کی ہر سانس میں...... اس روز وہ بالکل ہی ٹوٹ گئے تھے۔

''بابا جان میرا دل پھٹ جائے گا۔'' اور بابا جان نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے اپنے ساتھ بھینچ لیا تھا اور اُن کی آنکھیں بھی برس پڑی تھیں۔

''جانِ پدر حوصلہ کرو، ہمت باندھو، زندگی میں ایسے حادثات آتے رہتے ہیں اور انہیں برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ تقدیر سے نہیں لڑا جاسکتا جانِ عزیز...... تمہیں کچھ ہوگیا تو تمہارا یہ بوڑھا باپ کیا کرے گا...... اس کے پاس تو تمہارے سوا اور کچھ نہیں ہے...... تم ہی اس کی واحد پونجی ہو...... اکلوتی متاع ہو۔'' وہ اس طرح کبھی جذباتی نہیں ہوئے تھے لیکن اس روز ہوگئے تھے۔ کتنی کوشش کی تھی انہوں نے کہ ایک بار چندا اُن سے مل لے۔ ایک بار پھر وہ اسے قائل کرنے کی کوشش کریں لیکن وہ نہیں ملی تھی۔ پہلی طلاق بھیجنے کے بعد وہ کتنے پُر امید تھے کہ شاید اب...... شاید اب اسے خیال آجائے کہ اس نے مجھ پر غلط شک کیا...... شاید اپنے لیے نہ سہی، اپنی معصوم بیٹی کے لیے ہی رجوع کرلے لیکن اس نے رجوع نہیں کیا تھا اور وقت گزر گیا تھا۔ وہ پہلی طلاق کے بعد کتنی ہی بار اس کے گھر گئے تھے لیکن ہر بار پتا چلتا کہ وہ اپنی ممی کے ساتھ کہیں باہر چلی گئی ہے اور یہاں صرف اس کے ڈیڈی ہیں۔

''وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے بابا جان...... میری بیٹی کو مجھے بتائے بغیر کہیں اور کسی دوسرے ملک میں لے جائے۔ میں کیس کر دوں گا، مجھے اپنی بیٹی سے ملنے کا پورا حق ہے۔''

''ہاں تمہیں حق ہے بیٹا...... لیکن کیس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے...... وہ ملک میں واپس آجائے تو میں بات کروں گا اس سے۔''

بابا جان نے انہیں نرمی سے سمجھایا تھا لیکن وہ واپس نہیں آئی تھی اور دوسری اور پھر تیسری طلاق بھی بھجوا دی تھی انہوں نے...... اور وہ رشتہ جو بہت چاہ، بہت محبت اور شوق سے قائم کیا گیا تھا پھر کبھی نہ جڑنے کے لیے ٹوٹ گیا تھا...... اور وہ بلک، بلک کر روتے، تڑپتے...... اور بابا جان سے ان کی تڑپ دیکھی نہ جاتی تھی۔ ان کے غم نے انہیں بھی اندر سے ڈھا دیا تھا۔ انہوں نے خود اکیلے چندا کے گھر کے چکر لگائے تھے۔ اس کے ڈیڈی سے ملے تھے اور درخواست کی تھی کہ بچی کو باپ سے ملنے کا حق ہے۔ آپ کیوں ایک باپ کو اس حق سے محروم کرتے ہیں اور تب انہوں نے بابا جان کو بتایا تھا کہ چندا بہت اپ سیٹ تھی۔ اس لیے انہوں نے اسے اپنی ممی کے ساتھ لندن بھجوا دیا ہے۔ جہاں ان کے کوئی کزن رہتے ہیں...... عدت تک اب وہ وہاں ہی رہے گی۔ انہوں نے اس سب کے لیے افسوس کا اظہار بھی کیا تھا۔

''مجھے اس سارے واقعے کا بے حد افسوس ہے۔ ہم ایسا نہیں چاہتے تھے لیکن۔ ہم اسے فورس بھی نہیں کر سکتے تھے۔''

بابا جان نے یہ سب آکر انہیں بتایا تو وہ بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ اب سارا سارا دن چپ بیٹھے رہتے تھے۔ کالج جانا چھوٹ گیا تھا...... بابا جان کالج جاتے تو کئی بار خدا بخش کو فون کر کے ان کے متعلق پوچھتے...... گھر آکر ان کو کمپنی دیتے...... ہمہ وقت ان کے ساتھ رہتے، زبردستی انہیں باہر لے کر جاتے لیکن ان دنوں تو جیسے ان کے اندر سناٹے اتر آئے تھے۔ ایک جامد چپ تھی جو ان کے ہونٹوں پر جم گئی تھی...... ان دنوں بابا جان ان کے لیے بے حد

... پریشان رہنے لگے تھے اور اس پریشانی نے انہیں بیمار کر ڈالا اور ان کی بیماری نے جیسے اس جامد چپ کو توڑ دیا۔

''نہیں بابا جان، آپ کو کچھ نہیں ہو سکتا۔'' وہ تڑپ، تڑپ کر روئے تھے۔

''انشاء اللہ مجھے کچھ نہیں ہوگا لیکن وعدہ کرو تم بھی اس سب کو قبول کر لو گے اور خوش رہو گے۔'' انہوں نے وعدہ کر لیا تھا۔ بابا جان کی بیماری نے انہیں خوفزدہ کر دیا تھا۔ اگر بابا جان کو کچھ ہو گیا تو وہ کیا کریں گے۔ اکیلے تنہا ان کا تو دم گھٹ جائے گا...... ان دنوں ایک بار پھر انہوں نے نمازیں شروع کر دی تھیں اور اللہ سے رو، رو کر بابا جان کی صحت و زندگی کی دعائیں مانگی تھیں۔

بابا جان ہولے، ہولے صحت مند ہو گئے تھے۔ اور وہ بابا جان کی خاطر خوش نظر آنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اندر مسلسل برسات جاری رہتی تھی۔ انہیں چندا سے بے شمار شکوے تھے بہت سے گلے تھے۔ اس نے ان کا اعتبار نہیں کیا تھا انہیں صفائی کا موقع دیے بغیر فیصلہ سنا دیا تھا اور اس نے فیصلہ کرتے ہوئے ایک بار بھی اپنی بیٹی کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ جو صرف اس کی بیٹی نہیں تھی، ان کی بھی تھی۔ جسے صرف ماں کی نہیں باپ کی بھی ضرورت تھی لیکن چندا نے یہ سب نہیں سوچا تھا اور ان کے درمیان پہاڑ جتنے فاصلے حائل ہو گئے تھے...... لیکن اپنی بیٹی سے ملنے کا انہیں حق تھا اور وہ اس سے ملنا اور دیکھنا چاہتے تھے۔ اس روز بابا جان کالج گئے تو انہوں نے چندا کے گھر فون کیا...... فون ملازمہ نے ریسیور کیا اور ان کے پوچھنے پر بتایا کہ وہ لندن سے واپس آگئی ہیں۔ اور اس روز وہ کئی مہینوں بعد اس کے گھر گئے تھے۔ ملازمہ نے انہیں لان میں بٹھایا تھا اور بچی کو وہاں ہی لے آئی تھی۔ انہوں نے .... بے تابانہ اٹھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لیا تھا ان چند ماہ میں وہ کتنی پیاری ہو گئی تھی۔ گول مٹول، سرخ و سپید گال، چمکتی روشن آنکھیں...... وہ اسے چوم، چوم کر تھکتے نہ تھے اور ملازمہ دور کھڑی تاسف سے انہیں دیکھتی رہی تھی۔

وہ آوازیں نکالتی تھی...... گدگداتے تو ہنستی...... سیٹی بجاتے تو خوش ہوتی...... انہوں نے اس کے ننھے، ننھے ہاتھوں کو بھی کئی بار چوما...... ان کا جی چاہ رہا تھا وہ اسے اب خود سے جدا نہ کریں۔ اور اسے لے کر چلے جائیں دور کہیں جہاں چندا انہیں ڈھونڈ نہ سکے لیکن پھر جیسے اُن کا دل کانپ گیا...... نہیں بھلا چندا کیسے رہے گی اس کے بنا اور یہ اتنی چھوٹی سی بچی بھلا ماں کے بغیر کیسے رہے گی انہیں لگا تھا کہ وہ یہ ظلم نہیں کر سکتے...... ورنہ ملازمہ تو جا چکی تھی اور وہ اگر چپکے سے اسے لے کر نکل جاتے تو......

انہوں نے اس کی پیشانی چومی تب ہی کسی نے بچی کو ان کے ہاتھوں سے لے لیا۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا...... وہ چندا کا کزن تھا...... اور بڑی کینہ توز نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اور بڑے استحقاق سے بچی کو گود میں لیے کھڑا تھا۔

''آئندہ اس گھر میں قدم نہ رکھنا...... اور نہ ہی بچی سے ملنے کی کوشش کرنا...... ورنہ......''

''ورنہ کیا...... یہ میری بچی ہے اور مجھے اس سے ملنے کا پورا حق ہے۔'' وہ اس کی بات پر حیران ہوئے تھے۔

''بالکل یہ تمہاری ہی بچی ہے اور تمہیں اس سے ملنے کا پورا حق ہے لیکن میں چاہتا ہوں تم اس حق کو استعمال نہ کرو...... اور بھول جاؤ کہ تمہاری کوئی بیٹی ہے، اسی میں تمہاری بیٹی کی بھلائی ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ وہ زندہ رہے اور خوش رہے تو پھر کبھی بھول کر بھی اس کا خیال دل میں نہیں لانا۔'' اس کے لہجے میں عجیب طرح کی سختی اور رعونت تھی۔

''لیکن کیوں...... تم مجھے اپنی بیٹی سے ملنے سے کیسے روک سکتے ہو...... میرا اور اس کا رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ یہ میری بیٹی ہے میں ضرور اس سے ملوں گا اور اگر تم نے مجھے ملنے سے روکا تو میں عدالت میں جاؤں گا۔'' انہوں نے احتجاج کیا تھا انہیں اس وقت چندا کا وہ کزن انتہائی برا لگا تھا بھلا وہ کون ہوتا ہے انہیں اپنی بیٹی سے ملنے سے روکنے والا۔

''بہت شوق سے۔'' اس کے لبوں پر بڑی مکارانہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ ''جب تک عدالت فیصلہ کرے گی تمہاری بیٹی کی ہڈیاں تک گل چکی ہوں گی۔'' اس نے بے حد سفاکی سے کہا تھا۔
''میں تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ اگر بیٹی کی زندگی اور خوشی چاہتے ہو تو اس کی زندگی سے نکل جاؤ...... یہ بہت خوش رہے گی اور شہزادیوں کی طرح پرورش پائے گی اور دوسری صورت میں پھر تم اپنے بیٹے کی طرح اس کی لاش بھی نہیں دیکھ پاؤ گے، گلا گھونٹ کے جنگل میں پھینک دوں گا...... میں اسے۔'' وہ پوری جان سے لرز گئے تھے۔
''نہیں، نہیں...... '' ان کے لبوں سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی تھی۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے...... تم بھلا ایک اتنی چھوٹی معصوم سی بچی کو کیسے مار سکتے ہو؟'' انہوں نے اسے گود میں لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے تھے لیکن اس نے بچی کو پیچھے کر لیا تھا۔
''ہاں میں ایسا نہیں کروں گا لیکن اس کے لیے ایک ہی شرط ہے کہ تم اسے بھول جاؤ...... کبھی مڑ کر پیچھے مت دیکھنا اگر تمہیں اپنی بچی سے محبت ہے اور تم اسے زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو ورنہ......''
اس کا لہجہ پہلے جیسا ہی سفاک تھا۔ وہ جیسے کھڑے، کھڑے شل ہو گئے تھے آنکھوں کے آگے دھند سی چھا گئی تھی اور اس دھند میں سامنے کھڑا شخص اور اس کے بازو میں موجود بچی اس دھند کے پیچھے جیسے چھپ سے گئے تھے۔
''نہیں...... '' انہوں نے اپنے جسم کی پوری طاقت صرف کر کے کہا۔
''کیا نہیں...... '' اس کی آواز انہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔
''اگر تمہیں منظور نہیں ہے تو پھر اس کی لاش بھی نہ دیکھ پاؤ گے۔ گلا گھونٹ کر کسی جنگل میں پھنکوا دوں گا۔'' اس نے دوبارہ اپنی بات دُہرائی تھی۔
''نہیں...... '' ان کے لبوں سے پھر نکلا تھا اور دونوں ہاتھوں میں سر تھامتے ہوئے وہ بیٹھ گئے تھے۔ سر چکرا رہا تھا...... کچھ دیر بعد جب دل قابو میں آیا اور آنکھوں کے آگے سے دھند چھٹی تو انہوں نے دیکھا وہ بچی کو اٹھائے واپس اندر کی طرف جا رہا تھا، اُن کا دل اپنی بیٹی کو ایک بار پھر دیکھنے اور گود میں لینے کے لیے مچلا...... انہوں نے اٹھتے ہوئے ایک قدم اس کی طرف بڑھایا لیکن پھر اسی انجانے خوف نے ان کے پاؤں جکڑ لیے...... وہ لکڑی کا بھاری دروازہ کھولتا ہوا اندر چلا گیا اور وہ وہاں ہی کھڑے رہ گئے۔ انہیں لگا تھا جیسے وہ بالکل خالی ہو گئے ہوں۔ تہی داماں، خالی وجود کے ساتھ وہ سر جھکائے اس کے گھر سے نکلے تو اُن کے ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ سب کچھ جو چندا کے کزن نے ان سے کہا تھا، وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھے۔ ''اس نے ایسا کیوں کہا...... وہ کیوں نہیں چاہتا کہ میں اپنی بیٹی سے ملوں...... کیا وہ صرف مجھے دھمکا رہا تھا یا وہ سچ مچ ایسا ہی کرے گا۔ وہ اسے مار ڈالے گا۔ نہیں...... میری بیٹی زندہ رہے...... خوش رہے میں اس سے ملوں یا نہیں ملوں...... میرے لیے یہ ہی کافی ہوگا کہ وہ ہے۔ اسی دنیا میں موجود ہے۔ سانس لیتی ہے، جیتی ہے۔''

وہ جب اپنے خیالات میں ڈوبے گھر پہنچے تو بابا جان کالج سے آچکے تھے اور اب پریشان سے خدا بخش سے پوچھ رہے تھے کہ وہ کہاں گئے ہیں؟ انہیں آتے دیکھ کر وہ بے تابی سے ان کی طرف بڑھے تھے۔
''کہاں چلے گئے تھے میری جان؟''
''بابا جان میں اسے دیکھنے گیا تھا۔ وہ بہت پیاری ہو گئی ہے...... اس نے میری انگلی اپنی مٹھی میں پکڑ لی تھی...... میں اس کی ناک پکڑ کر ہلاتا تو وہ کھل کھل کر کے ہنسنے لگتی تھی۔ لیکن بابا جان...... وہ......'' وہ کچھ کہتے، کہتے رک گئے وہ انہیں چندا کے کزن کے متعلق بتانا چاہتے تھے کہ اس نے ان سے کتنی ظالمانہ باتیں کی ہیں...... لیکن انہوں نے بابا جان کے چہرے کو دیکھا جو بہت اشتیاق سے ان کی باتیں سن رہے تھے اور انہوں نے چپ سادھ

لی......نہیں وہ بابا جان کو نہیں بتائیں گے......

''میں نے پہلے ہی انہیں کتنا پریشان کیا ہے......اب اور پریشان نہیں کروں گا۔''

اور یہ چپ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی گئی۔ ان کے اعصاب کمزور ہو چکے تھے۔ کبھی ان کا دل چاہتا وہ اس شخص کی باتوں کی پروا کیے بغیر اپنی بیٹی سے ملنے چلے جائیں بھلا وہ شخص اتنا ظالم کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک معصوم سی بچی کو مار ڈالے اس بچی کو جو اس کی کزن کی بھی بیٹی ہے صرف ان کی بیٹی نہیں ہے۔ لیکن جب بابا جان ان کی مسلسل چپ سے گھبرا کر کہتے۔

''چلو اپنی گڑیا سے ملنے چلتے ہیں۔''

تو وہ خوفزدہ ہو جاتے......ان کے وجود پر لرزہ طاری ہو جاتا......ان کی آنکھوں کے سامنے خون میں ڈوبی ننھے بچوں کی لاشیں آنے لگتیں......وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتے......بابا جان کے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیتے۔

''نہیں بابا جان نہیں......'' ان کی آواز بھی لرزنے لگتی تھی۔

ان کا ذہن ایک بار پھر اپنے مرکز سے ہٹ رہا تھا۔ وہ راتوں کو خوفناک خواب دیکھتے اور چیخ مار کر اٹھ جاتے تھے......تب بابا جان ایک بار پھر انہیں ڈاکٹروں کے پاس لے کر جانے لگے تھے۔

''بابا جان میں ٹھیک ہوں......آپ پلیز پریشان نہ ہوں۔'' وہ انہیں یقین دلاتے لیکن پتا نہیں کیوں انہیں یقین نہیں آتا تھا، ان کی آنکھوں میں نمی پھیل جاتی تھی۔

''میں پریشان نہیں ہوں......لیکن میں چاہتا ہوں تم بالکل ٹھیک ہو کر جاب کرو......اور مصروف ہو جاؤ۔'' اور وہ سوچتے بابا جان صحیح کہتے ہیں۔ وہ اگر مصروف ہو جائیں گے تو یہ جو ان کا ذہن ہر وقت الجھا رہتا ہے شاید ان الجھنوں سے نجات مل جائے......اور وہ بابا جان کے ساتھ چل پڑتے۔ موسم گرما کی چھٹیاں ہوئیں تو بابا جان شاید ان کے ڈاکٹر کے مشورے سے ہی ان کے ساتھ گاؤں آگئے تھے۔ وہ ایک طویل عرصے کے بعد گاؤں آئے تھے۔ یہاں پھپو تھیں اور بابا جان کے دو چار کے چند ایک رشتے دار ان کا قیام پھپو کے گھر تھا......گاؤں کے ماحول میں ان کا دل بہل گیا تھا......ڈاکٹر کی دی گئی دوائیاں بھی بابا جان باقاعدگی سے استعمال کرواتے تھے......ہولے، ہولے ان کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ اب وہ گھنٹوں ایک جگہ خاموش بیٹھے نہیں رہتے تھے۔ بلکہ دوسرے معاملات میں دلچسپی بھی لینے لگے تھے۔ انہوں نے اخبارات کے اشتہار دیکھ، دیکھ کر مختلف جگہوں پر جاب کے لیے اپلائی بھی کیا تھا لیکن خوابوں کا سلسلہ اب بھی باقی تھا......وہ خواب میں دیکھتے کہ وہ چندا کا کزن ان کی گڑیا کا گلا گھونٹ رہا ہے اس کے پیٹ میں چاقو گھونپ رہا ہے اور وہ لہولہان زمین پر پڑی ہے......وہ چیخ مار کر اٹھ جاتے تھے۔

''تمہارے ذہن پر کیا بوجھ ہے......کس بات سے خوفزدہ ہو جانم......مجھے بتاؤ۔'' بابا جان انہیں گلے لگاتے پیار کرتے لیکن وہ ان سے کچھ بھی نہیں کہہ پاتے کوئی خوف ان کا گلا گھونٹ دیتا......اگر بابا جان سب سن کر چندا کے ڈیڈی کے پاس چلے گئے یا چندا سے جا کر کہہ دیا تو وہ لوگ پتا نہیں یقین کریں یا نہ کریں لیکن ضد میں آکر اس نے ان کی بیٹی کو نقصان پہنچا دیا تو......اور وہ بابا جان کو بھی کچھ نہ بتا سکے۔

موسم گرما کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں اور بابا جان کا کالج کھل گیا تھا۔ وہ واپس لاہور آگئے تھے۔ پھپو نے بابا جان سے کہا تھا کہ وہ ان کی شادی کر دیں کسی بہت اچھی لڑکی سے تاکہ وہ چندا کا دیا دکھ بھول جائیں......لیکن وہ جانتے تھے یہ دکھ ختم ہونے والا نہیں ہے......اور بابا جان نے بھی بس سرسری ساذکر کیا تھا اور ان کے انکار پر خاموش ہو گئے تھے......لاہور آتے ہی انہیں ایک پرائیویٹ کالج میں جاب مل گئی تھی اور وہ مصروف ہو گئے تھے......اس مصروفیت نے ان کی ذہنی حالت پر اچھا اثر ڈالا تھا......اور بابا جان بھی کسی حد تک مطمئن ہو گئے تھے۔

خدا بخش نے ایک روز انہیں بتایا تھا کہ انہیں بتائے بغیر بابا جان دو بار چندا کے گھر گئے تھے لیکن چوکیدار سے پتا چلا تھا کہ وہ سب لوگ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں...... اور انہوں نے سوچا تھا کہ یہ اچھا ہی ہوا ہے۔ ورنہ کیا خبر وہ چندا کا کزن کیا کر گزرتا۔ زندگی کا ایک معمول شروع ہو گیا تھا۔ گھر، کالج اور پھر گھر...... وہ بابا جان سے ہر موضوع پر بات کرتے...... بابا جان بھی نئی کتابیں پڑھ کر ان سے ڈسکس کرتے، انہیں بھی پڑھنے پر اکساتے...... وہ کچھ پڑھنے کچھ نہیں لیکن بابا جان کی ڈسکشن دلچسپی سے سننے کی کوشش کرتے لیکن ان کے درمیان چندا یا اپنی بیٹی کے متعلق کوئی بات نہ ہوتی۔ دونوں اس موضوع پر بات نہ کرتے تھے۔ ہاں خدا بخش کبھی کبھی بے اختیار کسی بات پر چندا کو یاد کرتا اور وہ اگنور کر دیتے...... بظاہر زندگی کا یہ چیپٹر کلوز ہو چکا تھا لیکن کیا واقعی کلوز ہو گیا تھا...... شاید نہیں...... رات کو جب وہ بستر پر لیٹتے تو چندا کی کھنکتی ہنسی اس کی شوخیاں اور اس کی وارفتگیاں یاد آتیں اور گول مٹول سی سرخ و سپید گالوں اور چمکتی آنکھوں والی گڑیا کی قلقاریاں کانوں میں گونجتیں تو خود بخود ہی آنکھوں کے کونوں سے آنسو نکل نکل کر تکیہ گیلا کرنے لگتے۔

بابا جان کو بھی یقیناً چندا یاد آتی ہوگی اور انہیں اپنی پوتی کا خیال بھی آتا ہوگا جسے انہوں نے صرف دو تین بار ہی دیکھا تھا لیکن دونوں ہی ایک دوسرے سے اپنا درد چھپاتے تھے۔ انہوں نے اپنا درد چھپانا سیکھ لیا تھا...... وہ بابا جان کو دکھی نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن جانتے تھے کہ بابا جان کو اُن کا دکھ دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔

”آپ اپنا خیال بالکل نہیں رکھتے۔ بابا جان آپ خوش رہا کریں...... میں ٹھیک ہوں، میں نے اس حادثے کو قبول کر لیا ہے۔ جان لیا ہے کہ میری تقدیر میں یہی لکھا تھا اور انسان تقدیر سے نہیں لڑ سکتا۔“ اس روز وہ ان کے کمرے میں ان کے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھے انہیں بہت غور سے دیکھ رہے تھے اور انہیں شدت سے احساس ہوا تھا کہ بابا جان بہت کمزور ہو گئے ہیں...... وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔

”کیا تم واقعی چاہتے ہو کہ میں خوش رہوں؟“ انہوں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

”میں ایسا کیوں نہیں چاہوں گا بابا جان...... میری وجہ سے آپ نے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔ بہت اذیت جھیلی ہے۔ اور اب جبکہ میں ٹھیک ہوں تو آپ بھی خوش رہا کریں۔“

”تم مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو تو شادی کر لو...... تمہارا گھر بس جائے گا...... تمہارے بچوں کو اپنے آنگن میں ہنستا بستا، کھیلتا دیکھوں گا تو سمجھو ہفت اقلیم کی دولت مل جائے گی مجھے۔“ اور وہ ساکت بیٹھے رہ گئے تھے۔

”کیا دل کی اجڑی بستیاں پھر سے بس سکتی ہیں۔ کیا چندا کی جگہ وہ کسی اور کو دے سکتے ہیں۔“

دل میں تو خاک اڑتی تھی...... اور کبھی نہ ختم ہونے والی ویرانی تھی لیکن انہوں نے زخمی نظروں سے بابا جان کی طرف دیکھا۔

”بابا جان مجھے تھوڑا وقت دیجیے سنبھلنے کے لیے...... ابھی اتنی جلدی میں خود کو کسی نئی آزمائش کے لیے تیار نہیں پاتا لیکن وعدہ رہا بابا جان میں آپ کی خوشی کی خاطر......“ اور ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ اور بابا جان نے یک دم اٹھ کر انہیں گلے لگا لیا تھا۔

”جانِ پدر...... جانتا ہوں یہ بہت مشکل ہے ابھی کچھ وقت گزر جانے کے بعد شاید یہ اتنا مشکل نہ لگے لیکن وہ وقت آنے تک پتا نہیں میں رہوں گا یا نہیں...... میں تمہارا بستا گھر دیکھنا چاہتا ہوں جانم۔“

”بابا جان پلیز ایسا مت کہیں...... آپ کو اللہ لمبی زندگی دے۔“ انہوں نے تڑپ کر کہا تھا۔

”میں آپ کے بغیر اس اتنی ظالم دنیا میں سروائیو نہیں کر پاؤں گا...... مجھے آپ کی بہت ضرورت ہے۔ آپ ایسی باتیں مت کیا کریں خدارا۔ جو آپ کا دل چاہتا ہے کریں۔“ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے لیکن دل کو جیسے

کوئی مٹھی میں لیے بار، بار بھینچتا تھا اور اذیت کی لہریں پورے وجود میں سرائیت کر جاتی تھیں۔
بابا جان نے جب اُن کی پیشانی چوم کر انہیں خود سے الگ کیا تو ان کے چہرے پر ایک الوہی سی روشنی تھی...... اور آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔
''تھینک یو بیٹا......'' انہوں نے ایک بار پھر سے ان کی پیشانی چومی تھی۔
''مونا کی والدہ کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی تھی کہ ان کی کوئی بیٹی میری بہو بنے...... سچ پوچھو تو مجھے بھی وہ بچیاں پسند تھیں۔ اب مونا کی تو شادی ہو چکی ہے۔ دونوں چھوٹی ہیں تم جو کہو...... دیکھی بھالی بچیاں ہیں...... جانے پہچانے لوگ...... ان جانے اور غیر لوگوں میں کرنے سے ڈر لگتا ہے...... نہ جانے آنے والی کیسی ہو۔'' بابا جان پُرجوش ہو رہے تھے وہ سر جھکائے خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے تھے...... لیکن اندر دل کی دنیا میں تلاطم بپا تھا۔
''ہاں تو تم نے بتایا نہیں کہ کون......؟''
''جو آپ کو پسند ہو بابا جان۔'' انہوں نے اپنا جھکا سر نہیں اٹھایا تھا...... مبادا بابا جان ان کی آنکھوں میں بکھرتی ویرانیاں دیکھ لیں۔
''تو ٹھیک ہے میں کل ہی جا کر مونا کی والدہ سے بات کرتا ہوں۔''
دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ معلوم نہیں کتنی صدیوں کا سفر وہ طے کر آئے تھے۔ عظام نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو کینٹین والا لڑکا سب کے لیے چائے لایا تھا، ساتھ میں سینڈوچز بھی تھے...... عظام نے اس کے ہاتھ سے ٹرے لے کر بینچ پر رکھی اور خدا بخش سے کہا کہ وہ بابا کو چائے دے اور خود بھی پی لے۔
وہ ابھی تک خالی، خالی نظروں سے عظام اور خدا بخش کو دیکھ رہے تھے۔
''بابا آپ چائے پی کر وہ ٹیبلیٹ لے لیں۔ جو میں نے آپ کو دی ہے۔''
وہ چونکے اور سر جھٹک کر ماضی کے حصار سے خود کو باہر نکالا۔
''تم کہاں جا رہے ہو؟''
میں آئی سی یو میں جا رہا ہوں...... جواد اور علی وغیرہ کو بھیجتا ہوں۔''
''تم چائے نہیں پیو گے۔''
''نہیں، میں نے کچھ دیر پہلے ہی پی تھی۔''
''اچھا ڈاکٹر سے پوچھنا رواحہ کے متعلق کہ اس کے زخم کب تک ٹھیک ہو جائیں گے۔'' عظام نے سر ہلایا۔
''جی بابا پوچھ لوں گا، ویسے میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ انشاء اللہ تین چار روز تک فارغ کر دیں گے اور ہو سکتا ہے اس سے پہلے ہی کر دیں۔''
''میں چلوں عظام تمہارے ساتھ؟'' انہوں نے بچوں کی طرح پوچھا۔
''نہیں بابا، آپ آرام کریں...... اس دوا سے آپ کو تھوڑی نیند آجائے گی تو فریش ہو جائیں گے...... اور رواحہ تو یوں بھی سو رہا ہے۔''
وہ بات کر کے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کسی نے دروازے کو ہلکا سا ناک کیا اور پھر ساتھ ہی دروازے کو کھول کر اندر قدم رکھا...... آنے والے کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے عظام حیران رہ گیا اور اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا۔
''ظفری......''

(جاری ہے)